ایک پادری کی

تازہ ہرزہ سرائی

تحریر

پروفیسر غلام نبی مسلم ایم اے

اسلامی مشن سنت نگر لاہور

تعارف

ہمیں افسوس سے یہ ضبطِ تحریر میں لانا پڑتا ہے کہ پادری برکت اے خان اور اسی قماش کے اور پادری پاکستان میں مذہبی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسلام پر، بانئے اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اور قرآن پر جو خدا کا واحد کلام ہے گستاخانہ، سوقیانہ اور بے ادبانہ بار بار حملے کرنے سے باز نہیں آتے اس سیالکوٹی پادری نے ہمیں ایک رسالہ بھیجا ہے۔ جس کا نام اس نے "درس اسلام" رکھا ہے۔ رسالہ کا یہ نام لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اس رسالہ میں اس نے ارادتاً اس قدر زہر چکانی کی ہے کہ مسلمانوں کا اسے پڑھ کر مشتعل ہونا لازمی ہے۔ ہوشیاری یہ کی ہے کہ اسے سائیکلوسٹائل کر کے تقسیم کیا ہے۔

زیر نظر رسالہ پادری برکت اے خان کے ایک تازہ "درس اسلام" کا جواب ہے۔ وہ انہی اعتراضات کو اس سے پہلے مختلف پیرایوں میں دہرا چکے ہیں۔ جن کا جواب ہم اس سے قبل مختلف رسالوں میں زیادہ تفصیل سے شائع کر چکے ہیں۔ ہم قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس رسالہ سے قبل ان رسالوں کو ایک نظر ضرور دیکھ لیں۔ تاکہ وہ ان مسائل سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کر سکیں۔ یہ رسالے اسلامی مشن سے مل سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم مسیحی دوستوں سے بھی کہتے ہیں کہ وہ خلوص دل سے اسلام کا مطالعہ کریں۔ تعصب کی عینک سے حقیقت کا پانا ممکن نہیں ہوتا۔ اور اگر انہیں نیک نیتی سے کسی بات کے بارے میں شک ہو تو وہ وضاحت کے لئے ہمیں لکھیں۔ ہم ان کی تشفی کی پوری کوشش کریں گے اور ہمیں یقین ہے۔ کہ انسانیت کے محسن اعظم اور مریم صدیقہ اور حضرت مسیح کے ناموس اور صداقت کے واحد اور عظیم ترین حامی و ناصر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی ضرور تصدیق کریں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

اختر احسن

پادری برکت اے خاں نے میرے نام بھی "درس اسلام" حصہ اول تا سوم کے عنوان سے ایک پلندہ ارسال کیا ہے۔ اور ان اوراق میں تمام باتوں کو زیادہ زہریلے الفاظ میں دہرایا ہے۔ جن کا جواب ہم پہلے ہی دے چکے ہیں۔ اس کے آغاز میں آپ لکھتے ہیں :۔

"ہمارا مقصد مذہبی تعصب اور طرفداری سے بالاتر ہو کر متلاشیان تحقیق حق کے لئے حقائق بیان کرنا ہے۔ ہم نے ہر بات کی صحت و اثبات کے لئے منقولہ اور علمی اور عقلی دلائل کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔"

پادری مذکور نے ان درسوں میں جن اتہامات کا اعادہ کیا ہے۔ وہ مذکورہ عبارت کے منہ پر چپت ہے۔ ان اتہامات پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس بات کا اعادہ ضروری ہے۔ کہ اگر اسلام، ہادئ اسلام اور ہمارے عقائد پر تنقید مطلوب ہے

تو اس کی بنیاد کلام الٰہی قرآن پاک پر ہونی چاہیے ، کیونکہ تمام مسلمانوں میں مشترک قرآن مجید ہے ۔ اور ہم تاریخ کی صرف ان باتوں کو مانتے ہیں جو قرآن حکیم پر مبنی ہیں ۔ چنانچہ ہمارے عہد کے نامور مورخ علامہ شبلیؒ اپنی معروف سیرۃ النبیؐ جلد اول میں مشہور امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کرتے ہیں ۔

"تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ۔ مغازی اور ملاحم اور تفسیر" (صفحہ ۱۸)

خطیب بغدادی نے لکھا ہے :۔

" فن تاریخ کی (ابتدائی دور) مشہور کتاب محمد بن اسحٰق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے ۔"

"امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہیں ۔ کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روائتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں ۔" صفحہ ۴۳

تاریخ کی کمزوری

"سیرت نبویؐ کے جو واقعات قلم بند کئے گئے ہیں وہ تقریباً نبوت کے سو برس بعد قلم بند ہوئے اسلئے (تاریخ ، مغازی ، سیرت کے) مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی ۔ بلکہ اکثر زبانی روائتیں تھیں ۔" صفحہ ۳۸

یاد رہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدائی کتابیں سیرت ابن اسحٰق ، سیرت واقدی سیرت ابن سعد ہیں ۔ ابن سعد واقدی کا ہی شاگرد تھا ۔ اور اسی کی روایت کا حامل تھا ۔ بعد میں طبری اور آنیوالے مؤرخوں نے انہی پر انحصار کیا ۔ اس لئے ان

راویوں کی باتیں آنکھیں بند کر کے قبول کرنا علمی و تاریخی بددیانتی اور حق دشمنی ہے۔

آمدن برسر مطلب

اگر آپ حق شناسی اور تعصب سے بالاتر ہوتے تو اپنی تحریروں میں ہماری گذارشات کو ملحوظ رکھتے مگر اللہ نے آپ کو ختم اللہ علیٰ قلوبہم کے مصداق اس سعادت سے محروم کر دیا ہے آپ نے "درس اسلام" حصہ اول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اور تاریخی حقائق کو چھوڑ کر ایسی دریدہ دہنی کی ہے کہ نادانستہ طور پر اپنے خداوند مسیح کو بھی نہیں بخشا اور ہم مجبور ہیں کہ جہاں آنحضرتؐ کی ذات والا صفات سے متعلق آپ کی خرافات کی تردید کریں وہاں آپ کو احساس دلائیں۔ کہ دوسروں کی آنکھ میں تنکا شاید اس وجہ سے نظر آتا ہو کہ جناب کی اپنی آنکھ میں شہتیر موجود ہے۔ ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

پادری برکت اے خاں آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ضمن میں لکھا ہے (زبان ملاحظہ ہو)

"حضور صلعم شہر مکہ شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کے
والد کا اسم گرامی عبداللہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو آپ کی
ولادت سے چند ماہ پیشتر ہی وفات پا گئے"

اگر آپ کے متعلق یہ کہا جائے کہ لوگ آپ کو فلاں کا بیٹا بیان کرتے ہیں۔ تو شاید آپ کو ندامت بھی محسوس نہ ہو گی۔ تاہم شرفا الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتا کرتے ہیں۔ لیکن آپ تو اس لئے شرم کو گھول کر پی گئے ہیں کہ آپ ایسے شنیع

پادری صاحب. حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ادب کو ملحوظ رکھیے بلکہ ہر انسان اور بالخصوص دینی بزرگوں کے خلاف زبان کو لگام دیجیے. کوئی بھی شریف مسیحی آپ کی تائید نہیں کرے گا. شیشے کے محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینکنا ٹھیک نہیں.

اگر آپ کا مقصد اس ملک میں مسیحی اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب کرنا اور اپنے آقایانِ ولی نعمت کے ٹکڑوں کو حلال کرنا ہے تو اس مقصد کیلئے غلط راہ اختیار کی ہے.

غلط واقعات اور گمراہ کن استدلال

آپ کو معلوم ہے کہ شیعہ، اہل سنت اور دوسرے مسلمان فرقوں کی تاریخی روایات میں شدید اختلافات ہیں۔ اس لئے محض قرآن کو اساس قرار دینا چاہیئے. تاہم آپ نے مکی زندگی سے متعلق جو کچھ لکھا ہے. نہ وہ درست ہے اور نہ اس سے اخذ کردہ نتائج صحیح ہیں

آنحضرتؐ کی پرورش

آپ کے تایا زبیر بن عبد المطلب نے کی تھی جو موحد اور کامیاب تاجر تھے۔ تاں زبیر کے انتقال

کے بعد ابو طالب کے زیر کفالت آ گئے تھے۔ آنحضرتؐ کے والد عبداللہ تاجر اور دولت مند تھے۔ آپ نے ان کا ترکہ پایا وہ ترکہ کاروبار میں لگایا۔ آپؐ نے تجارت کا فن سیکھا۔ بالغ ہو کر آزادانہ کاروبار کرنے لگے۔ اور کامیاب تاجر ثابت ہوئے، خدیجہؓ خوشحال تھیں۔ دولتمند نہ تھیں۔ اور حضورؐ خدیجہؓ کی دولت کے ہرگز محتاج نہ تھے

اُمّی قریش

قریش اس لحاظ سے اُمّی نہ تھے کہ وہ ان پڑھ تھے۔ عربوں میں صدیوں سے مہذب حکومتیں قائم تھیں، اور مکہ، یمن، عراق، شمالی عرب میں علم و ادب کا چرچا تھا۔ وہ اگر ان پڑھ ہوتے۔ تو جنگِ بدر کے بعد ان سے بچوں کے پڑھانے کا کام کیوں لیا جاتا اور وہ قرآن جیسی فصیح و بلیغ اور معلومات سے پُر کتاب کو کیسے قبول کر لیتے۔ وہ اس لحاظ سے اُمّی تھے کہ "ام القریٰ" (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے تھے۔ اُمّ کے ساتھ یائے نسبتی لگنے سے اُمّی مشہور ہوئے اور یہ نسبت کا تعلق تو انسانی زندگی کے ہر پہلو میں کارفرما ہے۔ جیسے پادری برکت مسیحی اور سیالکوٹی کہلاتے ہیں۔ قریش مکہ بھی اُمّی، مکی وغیرہ کہلاتے تھے۔ یہ مسلمانوں کے یہودی، مجوسی، اور عیسائی دشمنوں کی عیاری تھی اور مسلمانوں کی سادگی تھی کہ دشمنوں کے دام تزویر میں الجھ گئے اور تمام قریش کو ان پڑھ ٹھہرایا۔ لیکن صداقت کو ہمیشہ جھٹلایا نہیں جا سکتا اور آپ کو بھی اب بے وقت کی راگنی ترک کرنا ہی پڑے گی۔ ان ہی "امیوں" کی بدولت کوفہ، بغداد، دمشق، قاہرہ، قیروان، سمرقند، بخارا، قرطبہ، سائنس، فلسفہ، طب، ہیئت، ریاضی، فقہ، حدیث اور

دیگر فنون کے گہوارے بن گئے ۔ جہاں غیر مسلم بھی سیرابی کے لئے آتے تھے ۔ ان کی طرف جہالت کا انتساب احمقانہ جسارت ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ انجیل جناب مسیح سے متعلق سے کیا کہتی ہے ۔ "یسوع ہیکل میں جا کر تعلیم دینے لگا ۔ پس یہودیوں نے تعجب کر کے کہا کہ اس کو بغیر پڑھے کیونکر علم آگیا ۔ یسوع نے جواب میں ان سے کہا کہ میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے ۔" (یوحنا ۷ : ۱۴ - ۱۶) اور شاگردوں کی جہالت کے متعلق اعمال ۴ : ۱۳ کے علاوہ اناجیل کو دیکھ جایئے ۔

ابتدائی زندگی

آپ نے حضورؐ کی ابتدائی زندگی اور نزول وحی کے سلسلے میں بے سروپا باتیں کہی ہیں ۔ قرآن نے تو آنحضرتؐ کی قبل از نبوت زندگی کو آپ کی صداقت پر بطور سند پیش کیا جیسا کہ فرمایا :-

اے نبی مخالفین سے کہیے کہ

"میں نے دعویٰ نبوت سے پہلے تمہارے درمیان چالیس سال گزارے ہیں ، تو کیا تم میری گزشتہ زندگی اور صداقت شعاری کے پیش نظر میری آسمانی تعلیمات سے متعلق عقل و فکر سے کام نہیں لو گے ۔"

اور ایک دوسری جگہ فرمایا

"اے نبی وہ تجھے جھوٹا نہیں قرار دیتے بلکہ یہ دشمنانِ اسلام اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں ۔"

آپ نے لکھا ہے کہ تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ سے عیسائی او[illegible]

علما اور عوام سے دینی معلومات حاصل کیں اور دین اسلام میں ان کو شامل کیا۔ اوّل تو دنیا کے تمام نبیوں کی بنیادی تعلیم یکساں ہے۔ یہود و نصاریٰ اگر کچھ نہ تھے اور اسرائیلی انبیاء کی محدود اور وقتی تعلیمات کو تو اسلام نے مکمل اور عالمگیر کیا۔ اور اسلام اس لحاظ سے بہت ارفع، اعلیٰ اور ہمہ گیر ہے۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اس زمانے کے اسرائیلی علما سے استفادہ کیا تو پھر آپ کو اسلام قبول کرنے میں کیا عذر ہے۔ اسلام کی تعلیمات مکمل اور جامع ہیں۔ پھر آنحضرتؐ کو ۲۳ سالہ دورِ نبوت میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اس کی نظیر حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کی زندگیوں میں تلاش کرنا عبث ہے۔ اور مسیحؑ تو اپنی ناکامی کا خود اعتراف کر گئے

پھر آپؐ کو نہ اپنے گناہوں کے لئے کسی سے بپتسمہ لینا پڑا۔ نہ ہی شیطان نے آپ کو آزمایا۔ آپؐ ان باتوں سے بالاتر اور باوری تھے۔ آپؐ پر وحی کا نزول ہوا آپ بلا توقف اپنے منصب کے مطابق غلبۂ حق کی تبلیغ و تکمیل میں لگ گئے

آپؐ پر نزولِ وحی تدریجاً ہوا۔ اللہ کی سنت یہی ہے۔ اللہ اپنی تمام تعلیم ایک ہی وقت میں نہیں بھیجتا۔ تاکہ لوگ آہستہ آہستہ اسے قبول کرنے اور اس پر عمل کے عادی ہو جائیں۔ چنانچہ خود حضرت مسیحؑ نے ۳ سالہ دورِ نبوت میں وقتاً فوقتاً تعلیمات دیں۔ ایک ہی دن سب کچھ نہ بتا دیا۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو وہ اپنا مشن کسی آنیوالے کے لئے ادھورا نہ چھوڑ جاتے۔ مگر یہ سب کچھ اللہ کی حکمت اور مرضی سے ہوا۔ حضرت مسیحؑ کا کوئی دخل نہ تھا۔

سفید جھوٹ

آپ نے لکھا ہے کہ:۔

"آنحضرتؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں کفارِ مکہ پر آپؐ کی نبوت اور قرآن مجید کے پرچار کا ماسوائے چند نواحقین کے عوام پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

آپ کو معلوم نہیں صداقت فی نفسہٖ صداقت ہوتی ہے۔ اسے کوئی قبول کرے یا نہ کرے، کیا آپ مسیحیت کو اسی پیمانے سے نہیں ناپیں گے؟ حضرت مسیحؑ صداقت لے کر آتے۔ مگر دوسرے تو درکنار انجیل کی رو سے آپ کی والدہ اور بھائیوں نے بھی آپ کو قبول نہ کیا۔ زندگی بھر ۱۲ شخصوں نے آپ کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ انجام کار مسیح کو ایک شاگرد نے تو قید کروا دیا۔ دس بھاگ گئے اور سب سے چہیتے شاگرد نے ایک ہی رات میں آپ پر تین بار لعنت بھیجی اور انکار کر دیا۔ کیا اس سے حضرت مسیحؑ کی صداقت اور مقام پر کوئی حرف آتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اگر مکہ میں جناب کے خیال کے مطابق آنحضرتؐ کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی تو اس میں خرابی کیا ہے۔

مگر تعصب نے آپ کو اندھا کر دیا ہے۔ مکہ میں آنحضرتؐ کو کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے کامیابی ہوتی اور صرف نواحقین ہی میں نہیں تمام قبائل قریش میں آپؐ کو قبولیت حاصل ہوئی اور جنہوں نے آپؐ کو قبول نہ کیا وہ بھی آپ کی عظمت کے معترف رہے اور اگر آپؐ تیرہ سال کے بعد ہجرت کر گئے تو اس کی وجہ دینی اور جماعتی مصلحت تھی کہ مدینہ کے سازگار حالات میں رہ کر غلبہ اسلام کے لئے کام کر سکیں۔

خاص مکہ شہر اور قریشی خاندانوں میں جو خوش نصیب ایمان لائے وہ تاریخ عالم میں اپنے کارناموں کی بناپر مشہور ہوئے اور ان لوگوں نے اسلام کی خاطر جان، مال، وطن، گھربار، خویش و اقارب کو قربان کیا، ان میں سیدنا ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ اور بیسیوں دیگر قریشی اہل ایمان قریش کے مختلف خاندانوں کے نامور فرزند تھے۔ آپ کے چند لواحقین ہی نہ تھے۔ پھر مکی زندگی میں ہی مکہ کے باہر کے ہزاروں اہل عرب ایمان لائے۔ ان میں طفیل بن عمرو۔ یمن کے قبیلہ دوس کے سردار تھے۔ ان کی تبلیغ سے تمام قبیلہ دوس مسلمان ہو گیا۔ حبش کا بادشاہ اور اس کے بہت سے درباری ایمان لائے

مدینہ کے شمال میں قبیلہ غفار کا رئیس ابوذر غفاری اور ان کا نصف قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ مدینہ منورہ کے قبائل خزرج اور اوس کے ہزاروں لوگ مسلمان ہو گئے اور اسلام کی تقویت کا موجب ہو گئے۔ قبیلہ ازد کے رئیس ضماد بن ثعلبہ اور کئی دیگر لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس سے مکی زندگی میں آنحضرتؐ کی کامیابی کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے

مدنی زندگی

آپ نے لکھا ہے کہ:۔

"مدینہ پہنچ کر آپ کفار مکہ کے خلاف انتقامی منصوبے بنانے لگے۔ اہل مدینہ پہلے ہی مکہ والوں کے دشمن تھے۔ مسلمانوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ شمشیر اسلام نکالی۔ کفار کے

قتل کی آیات نازل ہونے لگیں وغیرہ۔" (ملخص)

تبصرہ

اگر آپ نے بغض و تعصب کا نہیں تو جہالت کا ضرور مظاہرہ کیا ہے۔ مکہ اور مدینہ کے لوگوں میں اسلام سے پہلے نہ کبھی دشمنی تھی اور نہ کبھی باہم لوٹ کھسوٹ ہوئی تھی۔ اس کے برعکس ان کی باہم رشتہ داریاں تھیں۔

حضورؐ کی والدہ مدینہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ باقی رہا مسلمانوں کی طرف سے لوٹ کھسوٹ یا انتقامی کارروائی۔ تو ان دونوں باتوں کا ثبوت آپ کے ذمے ہے۔ کیا آپ ایک بھی ایسا واقعہ بتا سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے آنحضرتؐ کے ماتحت یا آپؐ کے حکم سے کسی بھی قریشی کی قافلے پر حملہ کر کے لوٹا ہو اور اگر نہ بتا سکیں تو کسی قدر تو ندامت محسوس کیجئے۔ رہا انتقامی منصوبہ بندی تو ہر منصف مزاج انسان تسلیم کریگا کہ جو لوگ اپنی جان اور ایمان بچانے کے لئے حبش یا مدینہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے انہیں مدینہ پہنچتے ہی انتقام لینے کی کیسے توفیق ہوئی جب کہ مدینہ میں مسلمان مہاجر و انصار کی تعداد مدینہ کے یہود اور مشرکوں سے بھی کم تھی اور اس کمزوری کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے پانچ سال تک کفار مکہ ہر بار زیادہ طاقت کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرتے رہے۔ اور یہ تمام جنگیں، بدر۔ احد۔ احزاب ـ مسلمانوں کے مرکز مدینہ کے باہر یا اندر لڑی گئیں۔ جن میں مشرکین کی تعداد علی الترتیب ایکہزار۔ تین ہزار اور بیس سے تیس ہزار تک تھی اور مسلمان مقابلے میں تین سو، سات سو، اور

تین ہزار کی قلیل تعداد میں تھے۔ صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے صلح کی ہی راہ اختیار کی۔ اور کفار کی کڑی شرائط کے باوجود صلح کا معاہدہ کرلیا اور ۲ سال بعد جب قریش مکہ کی عہد شکنی کے بعد مسلمانوں نے مکہ پر قبضہ کیا تو آپ نے انتقام لیا؟ یا ان دیرینہ دشمنوں کو معاف کردیا؟ ایک پادری نہیں مہذب انسان کی حیثیت سے جواب دیجئے۔

آپ نے لکھا ہے کہ مشرکوں کے قتل کی آیات اُترنے لگیں۔ اور اس ضمن میں فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم سورہ توبہ کی آیت کا حوالہ دیا ہے۔

دجل و تلبیس کی کیا نادر مثال ہے۔

سورہ توبہ غزوہ تبوک کے بعد دس ہجری میں نازل ہوئی اور اس سے قبل ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد تمام اہل مکہ مسلمان ہوچکے تھے۔ اور غزوہ تبوک میں شامل تھے۔ عرب کے اکثر قبائل بھی اسلام قبول کر چکے تھے۔ پھر آپ بتائیے کہ اس سورۃ کے نزول کے بعد کتنے مشرک کب اور کہاں قتل ہوتے؟

ایسے "ان کو قتل کرو" کا حکم حملہ آوروں سے متعلق ہے۔

چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے

"اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے لڑیں لیکن حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حدود سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور انھیں جہاں پاؤ ان سے لڑائی کرو اور انھیں وہاں سے نکال دو۔

جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ قتل سے
بھی زیادہ سخت ہوتا ہے "

مسلمانوں نے سورہ حج کی اس آیت کے تحت مدافعت کی جس کا مفہوم
یہ ہے :-

" ان لوگوں کو دشمن کے مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے
جن پر ظلم کیا گیا اور اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے اور
اگر اللہ بعض لوگوں کی دوسرے لوگوں سے مدافعت
نہ کرتا تو مذہبی آزادی ختم ہو جاتی اور راہبوں کی خانقاہیں
گرجے، یہود کی عبادت گاہیں اور مساجد برباد کر دی
جاتیں "

اور ساتھ ہی سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا :-

" مسلمانو! ان لوگوں سے جنگ کرو۔ جو تم سے جنگ
کرتے آئے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے
والوں کو پسند نہیں کرتا "

اور انہی آیات کے ماتحت حریت ضمیر کی خاطر، قلت کے باوجود مسلمان کفار کے حملوں کا اپنے ہی شہر کے قرب و جوار میں مقابلہ کرتے رہے۔ اور ان جنگوں میں طرفین کا جانی نقصان ہوتا رہا۔ کیا انتقام کی یہی صورت ہوتی ہے۔ کہ ایک گروہ پر دوسرا گروہ بار بار چڑھائی کرتا رہے اور پہلا گروہ ہر بار اپنے بچاؤ کے لئے مقابلہ کرے۔ کیا ہر بار بچاؤ کرنے والے گروہ کو انتقامی کارروائی کا ملزم ٹھہرایا

جائے گا۔ کیا کوئی منصف مزاج مسیحی جواب دیگا؟

آنحضرت کے لئے دشمن کے مقابلے کی معقول وجہ تھی۔ مگر امن وسلامتی کے شہزادے" آپ کے خداوند نے کس لئے حکومت وقت کے خلاف قتال کا منصوبہ بنایا۔ اپنے شاگردوں کو ہر قیمت پر تلواروں سے مسلح ہونے کا حکم دیا۔ اور آپ کی تلقین کے زیر اثر گرفتاری کے وقت آپ کے ایک شاگرد نے ایک رومی سپاہی کا کان اڑا دیا۔ کیا یہ سب کچھ امن کی خاطر تھا

قرابت داری کا طعنہ

یہ استدلال کس قدر بے معنی ہے۔ کہ آنحضرت نے اپنے قرابت داروں ابوبکر صدیق رض۔ عمر فاروق رض، عثمان غنی رض اور علی رض کی مدد سے فتوحات اور اقتدار حاصل کیا۔ کیا ان چار افراد کی مدد سے ہی حضور اکرم ص نے تمام دشمنوں کو زیر کیا؟ کیا یہ بزرگ ان قرابتوں سے پہلے ایمان لائے تھے کہ بعد میں؟ اگر یہ چار اشخاص ہی کامیابی کا موجب تھے تو یہ مکہ میں ایمان لے آئے تھے۔ اس وقت مکہ پر قبضہ کیوں نہ کر لیا۔ آپ جس قدر فریب کاری سے کام لیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر کامیابی اور اپنے خداوند کی ناکامی کو نہیں چھپا سکتے۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کی جہالت سے شریف طبع مسیحی دوستوں کے سر ندامت سے جھک جائیں گے۔

بہکی بہکی باتیں

عہد نبوی کی جنگوں کے سلسلے میں آپ نے ..... ہر چہ خواہی گو" کے مصداق

بہت سی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ کہ مسلمانوں نے قافلوں کو لوٹنے سے جہاد بالسیف کی ابتداء کی۔ ان دونوں باتوں کی تردید ہم کر چکے ہیں۔ ایسی بے بسی کی حالت میں مال غنیمت کا لالچ خارج از بحث ہے۔ آپ دنیا کو یہ منوانا چاہتے ہیں کہ ایک ہزار مسلح قریشی جنگ جوؤں کے مقابلے میں ۳۱۳ غیر مسلح نوجوان، بوڑھے اور لڑکے مال غنیمت کے جوش میں نکلے۔ اور تین سو میل سے آئے ہوئے دشمن کے خلاف اپنے گھروں کے قریب لڑے، یہ بھی جھوٹ ہے کہ جنگِ بدر میں "بکثرت کفار مشرکین، غلام اور لونڈیاں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ خواندہ غلاموں کی جان بخشی کے لئے یہ شرط لگائی گئی کہ وہ دس دس اُمّی مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں"۔ جنگِ بدر میں نہ تو کوئی لونڈی اور نہ ہی غلام بنایا گیا۔ یہی صورت جنگِ احد اور احزاب کی تھی۔ دشمن لشکر کے ستر جنگجو قید کئے گئے اور عرب کے دستور کے خلاف ان خون کے پیاسے دشمنانِ اسلام کو حسب توفیق فدیہ یا محض مسلمانوں کو تعلیم دینے پر چھوڑ دیا گیا۔ دروغ گو را حافظہ نباشد کی کیا ہی اچھی مثال ہے آپ پہلے لکھ چکے ہیں۔ قریش مکہ اُمّی یعنی ان پڑھ تھے اور یہاں لکھ رہے ہیں کہ ان کے غلام بھی پڑھے لکھے تھے۔ پادری صاحب! عقل کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑ رہے ہیں۔ بھلا جس قوم کے غلام خواندہ تھے وہ خود کیسے ان پڑھ ہو سکتی تھی۔

جنگِ بدر میں سپہ سالار ابوجہل تھا۔ ابوسفیان نہ تھے۔ وہ اس جنگ میں شامل ہی نہ تھے اور حضرت ام حبیبہؓ سے حضورؐ کی شادی ۶ھ میں

ہوئی جبکہ صلح حدیبیہ ہو چکی تھی۔

غزوہ احد میں آپؐ زخمی ہوئے، بیہوش ہوئے اور دانت شہید ہونے کا ذکر کیا ہے۔ عقل کے دشمن پادری! اللہ کے نبی! انسانوں کے لئے نمونہ ہوتے ہیں۔ اور ان تکالیف پر راضی برضا رہتے ہیں جو راہ حق میں انھیں پیش آتی ہیں۔ تاکہ بعد کے لوگ تکالیف میں استقامت دکھائیں۔ بعض مسلمانوں نے آپؐ کے حکم کی پابندی نہ کی مگر غلبہ پھر بھی مسلمانوں کو حاصل ہوا۔ اور قریش مکہ بے نیل مرام لوٹ گئے۔

صلح حدیبیہ کو قرآن نے فتح مبین کہا ہے۔ اس سے جنگوں کا خاتمہ ہوا، ملک میں امن قائم ہوا، مسلمان اور کفار خون خرابہ سے رُک گئے اور حج کے بے خوف ہونے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ حضورؐ نے حکم الہیٰ سے خون ریزی ترک کر کے، اگلے سال امن کی فضا میں عمرہ ادا کیا۔ تو اس میں خرابی کیا ہے۔ یہ سب کچھ رضائے الہیٰ سے مسلمانوں کی بہتری کیلئے ہوا۔

کیا سب سے بڑے دشمنوں کا صلح پر آمادہ ہو جانا اور اپنے شہر میں دب کر مسلمانوں کو آزادانہ حج کی اجازت دینا اور خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مسلمانوں کا خانہ کعبہ کا حج کرنا ناکامی ہے؟ یہ تو فتح مبین تھی۔ اس کے بعد تمام قبائل میں اسلام پھیل گیا۔ سلاطین کو دعوتی خطوط لکھے گئے۔ اور دو سال بعد قریش پکے ہوئے پھل کی طرح اسلام کی جھولی میں آ گرے۔

اگر جنگ احد میں حضورؐ زخمی ہوئے تو کیا دشمنوں نے آپ کے خدا وند کو بقول اناجیل پیلاطوس کے دربار میں ذلت کا نشانہ نہ بنایا۔ ان کے منہ پر نہ

تھوکا، انہیں طرح طرح کے طعنے نہ دیئے اور پھر آپ کو صلیب پر نہ لٹکایا۔ کیا مسیح کے خدا نے ان کی مدد کی؟ کیا ان کی صلیب سے بچنے کی دردانگیز دعائیں قبول ہوئیں؟ اور کیا آپ کی منطق کی رو سے وہ ناکام و رسوا نہ ہوتے۔

پادری صاحب! اللہ کے بندوں کے ساتھ عجیب معاملہ ہوتا ہے۔ دنیا اس کو نہیں سمجھ سکتی۔ مگر یہ اللہ کے فرستادہ انجام کار غالب ہوتے ہیں۔ اور تاریخ کے اوراق ان کے سنہری کارناموں اور ابدی رشد و ہدایت سے منور و تاباں ہیں۔ اور حضرت مسیح کی اس پیشگوئی سے متعلق کیا رائے ہے:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان میں سے جو یہاں کھڑے ہیں بعض ایسے ہوں گے کہ جب تک خدا کی بادشاہی کو دیکھ نہ لیں موت کا مزہ ہرگز نہ چکھیں گے" (لوقا ۹: ۱۸)

"آنحضرتؐ کی پیشگوئی اگر آپ کے اجتہاد کے مطابق دوسرے سال پوری ہوئی تو حضرت مسیح کی پیشگوئی تو دو ہزار سال کے بعد بھی پوری نہیں ہوئی۔ بغلیں نہ جھانکئے جواب دیجیئے۔

بے سروپا باتیں

۸ھ میں آنحضرتؐ نے مکہ پر چڑھائی اس وقت کی جب کفار نے عہد نامہ حدیبیہ توڑ کر مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنی خزاعہ پر حملہ کیا۔ ان کے کئی آدمی قتل کر دیئے۔ حتیٰ کہ خانہ کعبہ میں بھی ان کا خون بہایا۔ مگر جب انہوں نے آنحضرتؐ کے سامنے ہتھیار ڈال ڈال دیئے تو آپؐ نے ان کی خطائیں معاف کر دیں۔ رہا ابوسفیان کا اسلام تو وہ سردار قوم تھے۔ وہ خوف سے کیوں ایمان لاتے۔ وہ تو اسلام لانے کے

بعد بھی اپنے دین اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ اور آخری وقت تک مردانہ وار لڑے۔ بزدل تو وہ تھے جنہوں نے کبھی رومی بن کر جان بچائی اور کبھی یہودی ظاہر کر کے، یا مصیبت کے وقت اپنے عقائد کو چھپاتے رہے۔ اور اپنے خداوند کو چھوڑ گئے۔ ابوسفیان اسلام سے متاثر تھے۔ فتح مکہ سے قبل ہی ان کے دو صاحبزادے یزیدؓ اور معاویہؓ اور ایک صاحبزادی ام حبیبہؓ ایمان لا چکی تھیں۔ اس نے زندگی بھر حضورؐ کو کبھی زبان یا ہاتھ سے اذیت نہ دی تھی۔ جنگِ بدر کے بعد حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے بحفاظت مدینہ جانے میں مدد دی۔ اور تجدید عہد کے لئے بلا خوف مدینہ چلا آیا تھا۔ اور حضورؐ کے دولت خانہ ہی میں قیام کیا تھا۔

عرب میں اسلامی ریاست بزورِ شمشیر نہیں قائم ہوئی تھی۔ یہ تو اہل اسلام نے خود بخود قائم کی تھی، البتہ اسے دشمنوں سے محفوظ کرنے کے لئے تلوار ضرور اٹھائی تھی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت اللہ کو جہالت اور شرک کے آثار سے پاک کیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خود حضرت مسیحؑ نے ہیکل سلیمانی کو غلط کار دنیا پرست لوگوں سے پاک کیا۔ اور اس مقصد کے لئے ان کا سامان زبردستی اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ خود حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو توڑ ڈالا تھا۔ جناب کو اس سے تکلیف کیوں ہوئی ہے؟

رہا حجرِ اسود تو یہ اسلام سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے دیوارِ کعبہ میں نصب کیا تھا۔ یہ طواف کے لئے نقطۂ آغاز تھا۔ اور کعبہ کے طواف کی ابتدا یہاں سے ہوئی تھی۔ مسلمان اسے ایک یادگار کی اہمیت دیتے ہیں لاکھوں

حاجیوں کی موجودگی میں تمام حاجی اسے ایک بوسہ دے سکتے ہیں۔ اور اس کے بغیر بھی محض اس کی طرف اشارہ کرنے سے حج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عباسی دور میں ایک مخالف طاہر اسماعیلی اسے اکھاڑ کر لے گیا تھا۔ اور چوبیس سال کے بعد شکستہ حالت میں اسے واپس کیا۔ مگر ان چوبیس سالوں میں حج کی ادائیگی متاثر نہ ہوئی۔ رہا روضۂ رسولؐ کی دیواروں کو چومنا۔ تو یہ اسلام نہیں۔ اگر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے تو اسلام اس کا ذمہ دار نہیں۔ اور ہر مذہب میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اظہار محبت و عقیدت میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ آنحضرتؐ سے محبت کا اظہار تو آپؐ کی اطاعت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی میں پوشیدہ ہے۔

ازواج النبیؐ

پادری صاحب! حضرت ماریہ قبطیہ آنحضرتؐ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ جناب نے خود لکھا ہے کہ پچاس سال کی عمر تک آنحضرتؐ نے ایک ہی اہلیہ سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ بسر کئے۔

پھر حضرت سودہؓ سے نکاح کیا۔

مدینہ پہنچ کر آپؐ کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے شادی کی وجہ یہ تھی کہ اس ذہین و فطین، عربی زبان، تاریخ و شعر و ادب کی ماہرہ کو اپنی نگرانی میں علوم دینیہ بالخصوص خواتین کے مسائل سے آگاہ کیا جائے۔ چنانچہ عائشہ صدیقہؓ دور اوّل کے علماء میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ پھر آنحضرتؐ ایک ریاست کے سربراہ بن گئے تھے۔ جنگوں میں کئی ایک قبائلی سردار مارے گئے تھے تو ان کی ازواج بیوہ ہو گئیں۔ ان کے وقار اور مرتبہ کو بحال رکھنے کے

لئے آپؐ نے ان کی خواہش پر ان سے شادی کی اور انھیں اعلیٰ مرتبہ عطا کر کے محفوظ کر دیا۔ اگر غرض عیش و عشرت ہوتی تو انھیں چھوٹے چھوٹے حجروں میں نہ رکھتے اور جب انہوں نے ایک بار نان و نفقہ میں فراغت چاہی تو انہیں رخصت کر دینے پر آمادہ نہ ہوتے۔ البتہ ان رشتوں سے کئی عرب قبائل آپؐ کی دشمنی سے دست بردار ہو گئے اور امن کو تقویت ہوئی۔

آپ کا اسرائیلی نبیوں پر ایمان ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی کتاب مقدس کی رو سے کم از کم تین بیویاں تھیں، یعقوبؑ کی چھ بیویاں اور "لونڈیاں" تھیں۔ دو بیویاں سگی بہنیں تھیں۔ عیسوؑ بن اسحٰق کی چار بیویاں تھیں۔ حضرت داؤدؑ کی ایک سو بیویاں تھیں تو حضرت سلیمانؑ کی ان سے بھی زیادہ تھیں۔ کیا یہ سب نعوذ باللہ شہوت پرست تھے؟ اللہ کے بندے نفسانیت نہیں خدائی مصلحتوں کے ماتحت ہوتے ہیں

پنجابی پادری ایک برطانوی پادری کے سوالات کا جواب دے

(نقل کفر کفر نہ باشد)

ٹورنٹو۔ ۲ فروری ۱۹۷۷ء ریورنڈ ارنسٹ ہیریسن عمر ۲۹ سال جو کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا تعلیمیافتہ تھا اسے ۱۹۵۲ء میں چرچ آف انگلینڈ سے تبدیل کر کے کینیڈا کے انگلیکن چرچ میں بھیجا گیا تھا وہ اپنی کتاب (A CHURCH WITHOT GOD) میں لکھتا ہے۔

"پیغمبر کی کہانی میں جب وہ عورت حضرت عیسیٰؑ کے پاؤں اپنے بالوں کے ساتھ پونچھتی تھی۔ اس نے یہ بڑا ہوشمندانہ فعل کیا۔ کیا عیسیٰؑ نے اس لمحے شدید جوش محسوس کیا؟ (ایوننگ سٹار کراچی)

وفات اور جانشینی

پادری صاحب! آنحضرت ؐ نے کامیاب زندگی بسر کی۔ آپ کا دین عرب میں غالب آچکا تھا۔ آپ نے باطل کو مٹا کر ملک میں آسمانی بادشاہت قائم کر دی تھی۔ آپ کا دین مکمل ہو چکا تھا۔ اور آپ نے ایک عظیم امت تیار کر لی تھی۔ جس نے آپ کا آسمانی مقصد پورا کیا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ آپ اپنا جانشین مقرر نہ کر گئے۔ کاغذ دوات منگوانے کی بات دشمنوں کا افسانہ ہے۔ قرآن کی رو سے آپ کی جانشین تمام امت مسلمہ تھی۔ کوئی شخص واحد نہ تھا۔ آپ نے واضح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنا دیا تھا۔ کہ: أمرهم شوریٰ بینهم۔ کہ اس امت کے اجتماعی (سیاسی، معاشی، عمرانی) امور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مشاورت سے انجام پایا کریں گے۔ اور وفات کے وقت چالیس ہزار مسلمان مدینہ میں موجود تھے۔ جنہوں نے ارشاد الٰہی کے مطابق ابو بکر صدیق ؓ کو اپنا امیر چن لیا۔ البتہ حضرت مسیح ضرور دنیا سے ناکام گئے اور اپنی بہت سی کہی جانیوالی باتیں ان کہی چھوڑ گئے۔ اور دنیا کو کسی مکمل اور مربوط نظام سے محروم کر گئے۔ اس کے علاوہ دنیا سے تشریف لیجاتے وقت آنحضرت نے نہ تو موت کا پیالہ ٹلنے کے لیے رو رو کر دعائیں مانگیں اور نہ ہی جناب کے خدا خداوند مسیح کی طرح "اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" کے مایوس کن الفاظ میں بے بسی کا اظہار کیا بلکہ آپ نے لقد رب الرفیق الاعلیٰ کے الفاظ میں اپنے رب کے ہاں جانے کی تمنا کا اظہار کیا۔ کیا ہی کامیاب زندگی اور کیسی قابلِ رشک تمنا!

انبیاؑ کی پاکیزہ زندگیاں

تمام انبیاؑ اپنے اپنے اور تمام زمانوں کے بہترین انسان تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ انسانوں کی رہنمائی کے لئے چنتا رہا۔ وہ ہر قسم کے گناہوں کی آلودگیوں سے پاک اور انسانوں کے لئے بہترین نمونہ ہوتے ہیں اور وہ بدیوں کو مٹانے اور نیکی کو پھیلانے اور قائم کرنے آتے ہیں۔ وہ صادق، امین، توحید پرست، صالح متقی، محسن، خلق خدا کے ہمدرد اور ہر قسم کی اخلاقی برائیوں سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے احکام کے کامل پابند ہوتے ہیں۔ اور ان کی اطاعت انسان کو اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ ایسے بزرگوں کو گنہگار قرار دینا کسی انسان کو زیبا نہیں دیتا۔ اس دنیا میں لاکھوں انسان ہر دور میں رہے ہیں۔ جو ان نبیوں کے پیرو ہیں۔ اور بدیوں سے بچتے اور نیک کام کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں اللہ کے نبیوں کو گنہ گار تسلیم کرنا عقلی دیوالیہ پن ہے۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے:۔

(اے رسول) "اور کوئی رسول تجھ سے پہلے ہم نے نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس لئے میری ہی عبادت کرو۔ تاہم وہ (عیسائی) کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا ہے۔ اس کی ذات ایسے عیبوں سے پاک ہے۔ رسول تو صرف اسکے معزز (تکریم کے لائق) اطاعت گزار

بندے ہیں۔ وہ نہیں بولتے جب تک وہ نہ کہے۔
اور وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہی عمل کرتے ہیں۔ اور
وہ ان کے آگے اور پیچھے کی سب باتیں جانتا ہے
اور وہ صرف اسی کی شفاعت کرتے ہیں جو وہ پسند
کرے۔ اور وہ ہر وقت اللہ کے خوف سے ڈرتے
رہتے ہیں۔" (انبیاء)

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء نے توحید کی تعلیم دی، شرک کی مذمت کی، وہ اللہ کے نیک معزز حکم بردار تھے۔ وہ صرف وہی کہتے تھے جو اللہ کا حکم ہوتا تھا۔ اللہ کے حکموں کے پابند تھے۔ ان کی زندگیاں اللہ کی نظر اور نگرانی میں تھیں۔ وہ اللہ کی اجازت سے ہی کسی کی شفاعت کرتے تھے۔ اور وہ ہر وقت اللہ کی نافرمانی اور اس کے حکموں کی نافرمانی کے تصوّر سے خوف زدہ رہتے تھے۔

یاد رہے کہ قرآن حکیم میں کوئی ایسی آیات مذکور نہیں جس میں انبیاء کو گنہ گار ٹھہرایا گیا ہو۔ اور نہ ہی قرآن حکیم میں کسی نبی سے گناہ کا کوئی فعل منسوب کیا گیا ہے۔ اور گناہ تو نبیوں کی سرشت کے خلاف ہے۔ سورہ انعام میں انبیاء کا نام لے کر ان کے راہ ہدایت پر ہونے کا ذکر ہے:۔

"اور ہم نے اس (ابراہیمؑ) کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ عطا کیے" ان سب کو ہدایت بخشی، اور ان سے پہلے نوحؑ کو راہ ہدایت دکھائی۔ اور اس (ابراہیمؑ) کی اولاد سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ ہے۔ اور ہم نیکوکاروں کو یونہی جزا

دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس سب کے سب نیکوکار روحت (صالحین) میں سے تھے۔ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط بھی، سب کو ہم نے اہل عالم پر فضیلت دی"۔

قرآن حکیم میں کئی آیات ان انبیاء کی فضیلت، نیکی اور اخلاق عالیہ پر شاہد ہیں۔ ان کی موجودگی میں قرآن کے بعض الفاظ کی روح کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انبیاء کے دشمنوں کو ٹھوکر لگی جس کی وضاحت پیش قارئین ہے۔

گناہ کی حقیقت

مذہبی اصطلاح میں گناہ اس فعل کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کر کے دانستہ ارادۃً کیا جائے جیسا کہ شرک، زنا، قتل، چوری، دروغ گوئی، بد دیانتی، کسی کی جان، مال آبرو پر حملہ، شراب نوشی، قمار بازی، حرام خوری وغیرہ۔ اور قرآن کی رو سے انبیاء ان عیوب سے پاک تھے۔ اس لیئے انہیں گناہ گار کہنا گناہ عظیم ہے۔ قرآن نے خدا کے قانون توڑنے والوں کو فاسق، مجرم، آثم، عاصی کہا ہے۔ جن کی سزا جہنم ہے۔ مگر کسی نبی کو ان الفاظ سے یاد نہیں کیا اور نہ ہی ان کی سزا جہنم ٹھہرائی ہے۔ بلکہ انہیں جگہ جگہ اخروی نعمتوں کا مستحق قرار دیا ہے۔ اور ان کی پیروی کو وسیلۂ نجات ٹھہرایا ہے۔

ذنب

عربی زبان میں ذنب کا لفظ اکثر چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں، غلطیوں، اور قصوروں کے لیئے آتا ہے۔ جیسا کہ جس بچی کو والدین نے زندہ دفن کیا ہوگا۔ اسے قیامت کے روز پوچھا جائے گا "تمہیں کس خطا یا قصور (ذنب) کی بناء پر قتل کیا گیا"۔ اب صاف بات ہے کہ بچی سے گناہ تو سرزد ہونے سے

رہا اس کا ذنب کوئی چھوٹی غلطی یا خطا ہی ہو سکتی تھی۔ سورہ فتح کی ابتدائی آیت "اے جماعت مسلمین! ہم نے تجھے فتح مبین عطا کی تاکہ تیری پہلی اور آئندہ اجتماعی کمزوریوں (ذنب) کو ڈھانپ دیا جائے۔" یہ سورہ امت مسلمہ کے غلبے کے ضمن میں اتری کیونکہ صلح حدیبیہ کے موقع پر تسلی تشفی اور خوشخبری کی ضرورت امت مسلمہ کو تھی آنحضورؐ نے تو خود صلح کی شرطیں طے کی تھیں۔ آپؐ اس کے محاسن سے واقف تھے اس لیئے اس سورت میں مخاطب عام مسلمان تھے۔ آنحضرتؐ نہ تھے۔ یہاں گناہوں کا ذکر نہیں۔ بلکہ پہلی جنگوں کی پردہ پوشی ہے۔ (اس کے اثرات کا خاتمہ) اور آئندہ جنگی کمزوریوں سے بچاؤ کی بشارت موجود ہے۔ اس آیت سے تین باتیں واضح ہیں اول اس کی مخاطب امت مسلمہ ہے کوئی فرد واحد نہیں دوم ذنب سے مراد زندگی کی کوتاہیاں، خطائیں وغیرہ ہیں۔ جن کا ازالہ زندگی ہی میں ہوتا رہتا ہے۔ اور استغفار کا مفہوم پہلی غلطیوں اور خطاؤں کے مضر نتائج سے بچاؤ اور آئندہ زندگی کے لیئے ممکن قصوروں سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس طرح استغفار کا حقیقی مفہوم اللہ تعالیٰ سے حفاظت اور مدد کی دعا کرنا ہے۔ کہ بشری کمزوریاں نیکی کے نیچے دبی رہیں اور نیکی کی زیادہ سے زیادہ توفیق ملے اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا کہ۔

"تو اپنی، مومنوں اور مومنات کی بشری کمزوریوں
سے اللہ کی مغفرت طلب کر"

توبہ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اگر کسی وقت انسان استغفار سے غافل ہو کر غلطی کر بیٹھے تو پھر خدا سے برائی ترک کرنے کا عہد کرے۔ اور خدا

کے سامنے سر جھکا دے ۔ ______________ یہی ایک سچا ذریعہ اللہ تعالیٰ سے قوت اور مدد طلب کرنے کا ہے ۔ قرآن حکیم نے کفار کے لیئے استغفار کا ذکر نہیں کیا اور اسے محض انبیاء اور مومنوں کی صفت بیان کیا ہے کہ وہ ہر گھڑی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہر قسم کی خطاؤں، جرموں اور گناہوں سے بچائے رکھے استغفار کو متقین کا اعلیٰ وصف بیان کیا ہے ۔

"متقین باغوں اور چشموں کے درمیان رہیں گے، اور وہ نعمتیں حاصل کریں گے جو ان کا رب ان کو دے گا۔ کیوں کہ وہ اس سے پہلے (دنیا میں) محسن تھے، رات کا بہت تھوڑا حصہ (یاد الٰہی کی وجہ سے) سویا کرتے تھے اور صبح کے وقت استغفار کیا کرتے تھے۔"

اس جگہ استغفار کو متقین (گناہوں سے بچنے والے نیک بندوں) کی خاص صفت بتایا گیا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہر صبح اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں سے بچاؤ کی دعائیں کرتے ہیں۔

"جو لوگ حق پر صبر اور نیک اعمال کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے" (ہود)

پس استغفار روحانیت کا ایک بلند مقام ہے اور غفر ذنب کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کی مدد سے بشری کمزوریوں پر غالب آ کر اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے کلی تابع کرلے۔ کہ اس کی بشریت اس کی روحانیت میں گم ہو جائے اور انبیاء چونکہ اپنے منصب اور مشن کے لحاظ سے گناہوں

سے پاک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے ذنوب بشری لغزشوں کے سوا کچھ نہیں ہوتے اور ان کا استغفار ممکن لغزشوں سے بچنے کی دعا کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ نیک فطرت انسان یہ نکتہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

آنحضرتؐ اللہ کے نبی تھے۔ قرآن آپؐ کو رحمت دوعالم ٹھہراتا ہے۔ آپؐ ہر گونہ بشری کمزوریوں سے بلند تر ہو کر انک لعلیٰ خلق عظیم، اخلاق عالیہ کی انتہائی بلندی، پر جلوہ فگن تھے۔ آپؐ نے دنیا کو کتاب و حکمت کا درس دیا اور لاکھوں انسانوں کی تطہیر کر کے انہیں ہر قسم کی برائیوں سے پاک کیا اور روحانی نشوونما کر کے اعلیٰ روحانی بلندیوں پر پہنچایا۔ اور خود دنیا کے لیے سراج ہدایت، بشیر و نذیر، داعی الی اللہ قمر منیر ٹھہرے۔ آپؐ کی پیروی ہی اللہ کے عاشقوں کو اللہ کا محبوب بناتی ہے۔ آپؐ ہی حضرت مسیح کی بشارت کے مصداق، وہ روح حق، فارقلیط، خدا کی بادشاہی کے قیم اور ان کے نامکمل مشن اور دین کو مکمل کرنے والے تھے۔ اور آپؐ کی شریعت تا ابد قائم اور باقی رہے گی۔

صلوات

مسلمان آنحضرتؐ پر درود و صلوات اس تڑپ سے بھیجتے ہیں کہ آپؐ کے دین کی ترقی اور غلبے سے دنیا میں آپ کا ذکر ہمیشہ بلند رہے۔ اور ہر آنے والا بچہ آپؐ کے دین، خلق، رحمت اور انسانیت نوازی کا اعلان کرتا رہے یہی مفہوم ہے اللہ اور فرشتوں کا آپ پر صلوات بھیجنے کا۔ اور یہی رفعنا لک ذکرک سے عیاں ہے۔ آخر آپ جب خدا سے کہتے ہیں کہ "تیری بادشاہی آئے۔" تو کیا خدا آپ کی دعا کا محتاج ہے۔ بلکہ آپ اپنے اور دوسرے انسانوں کے لیئے ایسے

مثالی دور کی دعا کرتے ہیں۔ جب کہ حق کا غلبہ ہو۔ دنیا سے بدی مٹے اور ہر طرف امن وسلامتی ہو۔ ورنہ خدا کی بادشاہی تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ کبھی تو سوچ لیا کیجیے۔

تحفظ قرآن

ایک لومڑی کی جب دُم کٹ گئی تو اس نے دوسری لومڑیوں کی دُمیں بھی کٹوانے کی تدبیر کی۔ یہی حالت آپ کی ہے۔ آپ حضرت مسیحؑ کی انجیل مقدس کو کھو کر کھسیانی بلی کی طرح قرآن حکیم کے کھمبے کو نوچنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

جنگ یمامہ میں (جو آنحضرتؐ کے وصال کے چھ ماہ بعد لڑی گئی) ہزاروں حافظ شہید ہو گئے۔ پھر ہزاروں حافظانِ قرآن ایسے ہوں گے جو بچ گئے۔ یا جنگ میں شریک ہی نہ ہوئے تھے۔ ان سب کے سینے میں ایک ہی قرآن تھا۔ جو انہوں نے آنحضرت سے سن کر حفظ کیا تھا۔ پھر بعض اصحاب مثلاً حضرت علیؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہ کے پاس لکھے ہوئے نسخے تھے۔ انہی کی مدد سے قرآن کا ایک نسخہ تیار کر کے حضرت حفصہؓ کے ہاں رکھوا دیا گیا۔ (کیا اس نسخہ کے سوا دوسروں کے پاس قرآن نہ رہے اور نہ ہی لوگوں کو زبانی یاد رہے؟) اسی قرآن کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے مختلف اسلامی ممالک اور مراکز میں پھیلا دیں۔ جو آج تک موجود ہیں۔ پس روزِ اوّل ہی سے قرآن کو ہزاروں حفظ کرنے اور لکھنے والے موجود رہے ہیں۔ جنہوں نے حکمِ الٰہی کے مطابق آنحضرت کی ہدایت کے ماتحت ایک خاص ترتیب سے قرآن کو حفظ کر لیا۔ اور ہزاروں بعد میں لاکھوں اور

کروڑوں میں بدلتے گئے۔

کیا آپ ایک دھوکہ بار بار دے کر حق کو غلط ثابت کر سکیں گے۔ پادری صاحب! آپ تو یہ ثابت کیجئے کہ جو کتابیں انجیل کے نام سے آپ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کیا یہ حضرت مسیح نے لکھیں، لکھوائیں یا آپ کے ارشاد سے شاگردوں نے لکھیں یا بعد میں بلا دلوگوں نے جوڑ کر دنیا کے سامنے پیش کیا؟ اس کا اعتراف آپ کے درس میں بھی ہے۔

قرآن کے متعلق آپ کو نہ بیان کے دورے متواتر پڑ رہے ہیں۔ اس کی موجودہ ترتیب اور اعراب کا حضرت عثمان سے کوئی تعلق نہیں۔ اعراب تو [illegible] حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے۔ تاکہ غیر عرب اسے صحیح پڑھ سکیں۔ موجودہ ترتیب آنحضرتؐ نے خود حکم الٰہی سے دی۔ جو اِنّا علینا جمعہٗ وقرآنہٗ سے ظاہر ہے۔ کتابٌ اُحکمت اٰیاتہٗ ثُمّ فُصّلت من لدن حکیم علیم اور ولقد وصّلنا القول کے الفاظ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آنحضرت اور دوسرے لاکھوں مسلمان صبح اسی قرآن کی نمازوں میں تلاوت کرتے تھے۔ اسی کو ابو بکرؓ نے لکھوایا۔ یہی عمر فاروقؓ کے دس سالہ دور میں ہر سال تراویح میں دنیائے اسلام میں پڑھا جاتا تھا۔ اور اس وقت سے آج تک پڑھا جا رہا ہے۔ اور اسی کی نقلیں عثمان غنیؓ نے پھیلائیں۔ کچھ تو عقل سے بھی کام لیجئے۔

کتابت وحی

آپ نے لکھا ہے کہ وحی الہام کا پہلا نسخہ کسی مسلم شخص کے قلم سے لکھا جانا ایک لازمی شرط ہے۔ لیکن قرآن مجید کا پہلا نسخہ کسی ایسے شخص نے اپنے قلم سے نہ لکھا تھا جس پر وحی نازل

ہوئی تھی۔" آپ اس بات کا ثبوت دیجیے کہ کسی مسلم نے کلام الٰہی کیلئے یہ لازمی شرط ٹھہرائی۔ کس اسرائیلی نبی نے اپنے ہاتھ سے کلام لکھا؟ کیا حضرت مسیح نے اپنی انجیل لکھی یا کسی سے لکھوائی۔ تو کیا اس وجہ سے آپ کی الہامی کتاب ناقابل اعتماد نہ ٹھہری؟

قرآن کے متعلق تو جناب نے خود لکھا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابت وغیرہ کے پاس قرآن کے ذاتی نسخے تھے، خباب بن ارتؓ کے پاس قرآن کی سورتیں تحریر تھیں جن کو پڑھ کر حضرت عمرؓ اسلام لائے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مسجد نبوی میں مصحف اسطوانہ ایک صندوق میں رکھا رہتا تھا جس سے مسلمان قرآن نقل کیا کرتے تھے۔ اور خود قرآن میں قرآن کے لکھے جانے کی طرف اشارہ ہے:۔

ترجمہ:۔ "اور کافر (قرآن کے متعلق) کہتے ہیں یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں۔ جو اس (محمدؐ) نے لکھ رکھی ہیں۔ سو وہ اسے صبح اور شام املا کروائی (لکھوائی) جاتی ہیں۔" (الفرقان)

پادری صاحب عقل کے ناخن لے کر اپنے علم کی درستی کر لیجیے۔ تاکہ اپنے خداوند کو تو بچا سکیں۔

قرآن و حدیث

قرآن حکیم اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ اور کسی دوسری کتاب کا محتاج نہیں۔ احادیث آنحضرتؐ کے اس اسوۂ حسنہ اور اقوال کا مجموعہ ہیں۔ جو قرآنی تعلیمات کے عملی پہلو سے متعلق ہیں۔ آنحضرتؐ نے اپنی حیات طیبہ میں قرآن حکیم کی تعلیمات پر ۲۳ سال تک خود عمل کیا۔ اور امت

کو اس پر قائم کیا۔ قرآن حکیم اور حضورؐ کا عمل لازم و ملزوم ہے، آپ کے بعد تمام کی تمام امت آپؐ کی سنت پر عمل پیرا رہی۔ محدثین نے صرف یہی کیا کہ آنحضرتؐ کی سنت کو کتابوں میں محفوظ کر لیا۔ اور اگر وہ تحریر میں نہ بھی لاتے تو بھی مسلمان نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر مناسک کو ادا کرتے رہتے۔ کیونکہ امت کثرت اعمال کی وجہ سے اسے فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود چونکہ بعض امور میں سہو و نسیان کا احتمال ہے۔ اسلیئے ہم مسلمان احادیث کی صحت کو قرآنی تعلیمات کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اور خلاف قرآن احادیث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

تاہم احادیث کے مجموعے اناجیل سے زیادہ مستند ہیں۔ کیونکہ محدثین نے احادیث کی صحت کے بڑے کڑے اصول وضع کیئے۔ اور راویوں کی ثقاہت کے سلسلہ میں سخت کاوش کی، اور روایت یا راوی کی معمولی کمزوری کو بھی نظر انداز نہ کیا۔ اور انہیں رد کر دیا۔ جبکہ اناجیل کے راویوں نے معمولی کاوش سے بھی کام نہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی روایات میں اختلاف و تضاد ملتا ہے۔ اور چونکہ حضرت مسیحؑ کی اپنی زبان کے الفاظ دنیا سے غائب ہیں۔ اس لیئے ان کے تراجم اغلاط سے پُر ہیں۔ اور اناجیل کی صحت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

ابراہیمؑ اور اونٹ

آپ کے باقی سوالوں کی طرح ہم بعض چیزوں کی حلت و حرمت کے جوابات بھی پہلے رسائل میں دے چکے ہیں۔ آپ بتائیے کہ بزرگ ابراہیمؑ نے کس کتاب میں اونٹ کو حرام قرار دیا تھا؟ عرب اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔ لازماً وہ اونٹ کا گوشت اپنے جد امجد ابراہیمؑ کے حکم کے مطابق کھاتے چلے آتے ہیں۔ اگر بعد میں اسرائیلیوں نے اونٹ

کو حرام ٹھہرایا تو اس میں حضرت ابراہیمؑ اور مسلمانوں کا کیا قصور ہے۔ ۱۔ قرآن حکیم نے اہل کتاب کا حلال کھانا کھانے کی اجازت دی ہے۔ یہ نہیں کہ اہل کتاب سے ان کا خنزیر کھاؤ اور ان کی شراب پیو۔ یا ان کی مشرک، بدکار اور فاحشہ لڑکیوں سے نکاح کرو۔ تمام صورتوں میں طعام کے حلال مشروب کی پاکیزگی اور خواتین کی پاکدامنی شرط اول ہے۔ ۲۔ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا حال سورہ صافات میں تفصیل سے مذکور ہے۔ تعصب کی عینک اتار دیجیے۔ ۳۔ جنت کی نعمتیں روحانی رنگ رکھتی ہیں۔ وہاں "شراب طہور" (پاکیزہ شربت) ہوگی۔ نہ وڈی مارکہ "بدبودار شراب" نہ ہوگی۔ نہ وہاں شہوانی جذبات ہوں گے۔ نہ کسی خاتون کو وہاں یعقوب یہوداہ وغیرہ کے جننے کے لیے کسی یوسف نجار اور دردزہ سے واسطہ پڑے گا۔ نہ بقول موجودہ اناجیل مسیح کو کسی مرتھا، مریم مگدلینی یا کسی عورت سے عطر لگوانے کی حاجت ہوگی۔ اور اگر مسلمانوں کو اس دنیا کی بدکاریوں سے محفوظ رہنے اور یاد الٰہی، پرہیزگاری اور نیک اعمال کی وجہ سے آپ کی بیان کردہ نعمتیں میسر آئیں گی تو آپ کو کس بات کا دکھ ہے۔ کیا آپ اس زندگی میں جنت کی موعود آسائشوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر نہیں بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو پھر دوسری زندگی میں ان سے نفرت کیوں؟ بھلے انسان! قرآن حکیم نے آئندہ زندگی میں دنیوی زندگی کی آسائشوں کا ذکر تمثیل کے طور کیا ہے ان نعمتوں سے مراد وہ سکون، وہ راحت اور تسکین ہے جو ان اشیاء سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ان کے حصول کے لیے ایمان اور صالح اعمال درکار ہیں قرآن نے بتایا ہے۔

اس جنت کی مثال جس کا وعدہ نیک بندوں سے کیا گیا ہے اس باغ کی ہے، جس میں ایسے دریا بہتے ہیں جن کے پانی کا ذائقہ متغیر نہیں ہوتا۔" (۴۷ : ۱۵)

پادری صاحب یہ ہیں جنت کی نہریں جن میں خمر کی لذت پائی جاتی ہے۔ بدمستی نہیں،

"اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے آئندہ کی زندگی میں آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ خفیہ رکھا گیا ہے یہ ان کے ان نیک عملوں کا بدلہ ہے، جو انہوں نے دنیا کی زندگی میں کیے۔" (۳۲ : ۱۷)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں۔ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور جن کا تصور بھی کسی دل میں نہیں آیا۔" (بخاری ۵۹ : ۸)

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

قرآن کی فصاحت پر پچر اعتراض

پادری صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن کا ادب بہت پرانا ہے۔ اور اس کے محاورات کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی "فارسی کی ضرب المثل ہے۔ "قیمتِ زعفران چہ داند خر" یا۔ "خر چہ داند لذت ادرک" آپ نے عربی کہاں سے پڑھی کہ عربی ادب کے پھٹے میں دم پھنسانے لگے۔ عربی ایک زندہ زبان ہے۔

اور قرآن دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے اس لیئے اسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔ ؎ آفتابش را زوالے نیست نیست

دشمن او را کمالے نیست نیست

ہم قرآن کا ایک جملہ اعراب کے بغیر لکھ دیں گے آپ اس پر اعراب لگا دیں ہم آپ کی عربی دانی کے قائل ہو جائیں گے۔ کیا آپ کو منظور ہے؟ اور آپ نے یہ کیا بے معنی بات لکھی ہے کہ "جن اردو ادب کے علماء نے قرآن مجید کے اردو میں ترجمے کیئے ہیں ان کے ترجمہ میں اردو ادب اور ان کے معانی و مفہوم میں فصاحت و بلاغت کی عظمت نظر نہیں آتی۔" (پادری صاحب! آپ اپنے اس فقرے کا سلیس اردو میں مفہوم ادا کیجیئے تو ہم آپ کی اردو دانی کے بھی قائل ہو جائیں گے۔) ویسے آپ نے ترجمہ کے نقص کو فصاحت قرآنی کے خلاف بطور دلیل پیش کر کے مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ کی تائید کی ہے۔ اگر ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان کے حسن کا عکاس نہیں ہے۔ تو قصور کس کا ہے؟ اس جملے کے بعد تو آپ کو کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیئے۔

آپ نے قرآن حکیم کے حروف مقطعات پر اعتراض کیا ہے۔ عربی زبان میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ جو لوگ ایمان لائے وہ ان کا مطلب جان کر ایمان لائے۔ اور جنہوں نے انکار کیا انہوں نے الفاظ پر اعتراض نہ کیا۔ کیونکہ وہ اس اسلوب بیان اور الفاظ کے مفہوم سے واقف تھے۔ آپ انگریزی سے واقف ہیں۔ اس قسم کے مقطعات عام ہیں۔ چنانچہ جو لوگ زبان سے آشنا ہیں وہ بی۔ اے۔ ایم اے یو۔ این۔ او۔ یونیسکو وغیرہ الفاظ کے معنی جانتے ہیں۔ حالانکہ یہ بیچلر آف آرٹس،

ماسٹر آف آرٹس، یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن وغیرہ کا مخفف ہیں۔ خود آپ کے نام برکت اے خان میں "اے" کا لفظ مخفف ہے اصل لفظ کا۔ اب اگر ایک ان پڑھ شخص اسے نہ سمجھ سکے یا غلط پڑھے تو چشمۂ آفتاب کا کیا قصور؟ پس اس میں قرآنِ حکیم کی فصاحت پر حرف نہیں آتا۔ قصور ان کے فہم و بصیرت کا ہے، جو سمجھ نہیں سکتے۔ آپ ہوں یا کوئی دوسرا علامۂ عصر!

"ماہ نور می فشاند و سگ عو عو می کند۔"

درسِ دوم — خود فریبی کا شاہکار

اس حصہ میں آپ نے حضرت مسیحؑ اور آنحضرتؐ کے مشن اور عمل کا موازنہ کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ نے لکھا ہے کہ "جناب مسیحؑ نے یوحنا سے بپتسمہ لیا اور اس کے بعد چالیس روز فاقہ کیا اور شیطان نے آپ کو دولت اور حکومت کا لالچ دیا کہ مجھے سجدہ کرو اور حکومت اور دولت لو۔ مگر جناب مسیحؑ نے خدا کی عبودیت کا اظہار کر کے اس مشرکانہ شرط پر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر پیغمبر اسلام نے دولت، حکومت اور دنیا کی عزت کی خاطر ہجرت کی اور یہ دنیوی مناصب حاصل کیے۔"

تبصرہ انجیل کی رو سے یوحنا گناہوں سے توبہ کے لیے لوگوں کو بپتسمہ دیتے تھے۔ مسیحؑ بھی گناہوں سے توبہ کے لیے بپتسمہ لینے گئے۔ اور بپتسمہ لینے کے بعد ریاضت کرنے لگے اور حضرت یوحنا کی ہدایت سے چالیس دن ریاضت کرتے رہے۔ آپ نے کشفی طور پر کبوتر کی شکل میں روح القدس کو دیکھا اسی طرح شیطان

سے ملاقات کی اور اس سے مکالمہ ہوا ، یہ ایک کشفی نظارہ تھا ۔ اور جناب مسیح کی روحانی تطہیر کا ذریعہ بنا ۔ ورنہ ظاہری آنکھوں سے روح القدس کو کبوتر کی شکل میں دیکھنا ۔ شیطان سے ملاقات ، اور زمین و آسمان کی بادشاہت کا دیکھنا حقیقت سے دور ہے ۔ اور نہ ہی شیطان میں یہ قوت ہے کہ وہ دنیا کی بادشاہت دکھا سکے یا کسی کو عطا کر سکے ۔ کیونکہ یہ مقام اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے ۔ مسیح ان ہزاروں یہودیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے گناہوں کا بپتسمہ لیا ۔ ورنہ یوحنا نے مسیح کو چنداں اہمیت نہ دی اور جب مسیح نے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی تو یوحنا قید خانے میں تھے ۔ شاگردوں نے یوحنا کو مسیح کے کارناموں سے اطلاع دی ۔

"اس پر یوحنا نے اپنے شاگردوں میں سے دو کو بلا کر خداوند کے پاس یہ پوچھنے کو بھیجا کہ آنے والا تو ہی ہے یا ہم دوسرے کی راہ دیکھیں" (لوقا ، ۱۹)

جناب مسیح نے گول مول جواب دیا اور حضرت یوحنا مسیح کی تصدیق کئے بغیر دنیا سے چلے گئے ۔ اس کے برعکس جو تعریفی کلمات یوحنا کی زبان سے مسیح کے متعلق بتلائے جاتے ہیں وہ کسی دوسرے عظیم انسان سے متعلق معلوم ہوتے ہیں ۔ نیز مسیح نے شیطان سے دنیا کی دولت غیر مشروط رد نہیں کی تھی ۔ بلکہ اسے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو سجدے کے بدلے میں لینے سے انکار کیا ۔ چنانچہ حضرت مسیح نے یہودیوں کا بادشاہ ہونے کا اعلان کیا اور آپ کے خلاف حکومت کا ایک الزام بھی تھا (لوقا ۲۳ : ۳۸)

پھر آپ نے جبری تسلط کے لئے اپنے شاگردوں کو تلواریں خریدنے کو کہا اور یہوداہ اسکریوطی پیسے اکٹھے کرنے کے لئے خزانچی مقرر کیا ۔

ان حالات میں " آسمانی بادشاہت " کے قریب ہونے کا مطلب یہی سمجھا گیا ہے کہ آپ اپنے ماتحت یہود کی سلطنت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو وہ مسیح کی آمد سے وابستہ کرتے تھے۔

اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض غلبہ دین تھا۔ کہ سورہ "صف" میں ہے

ترجمہ: " اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ اسے دوسرے دینوں پر غالب کرے خواہ یہ کافروں کو ناپسند ہی ہو "

اس میں مذہب اور سیاست کی تخصیص نہیں کی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں غلبہ مراد ہے۔ زندگی ایک اکائی ہے۔ اس لئے دین انسانی حیات کے ہر شعبے پر غالب ہے۔ یہ جملہ کہ "قیصر کا قیصر کو اور خدا کا خدا کو دو" ظاہر کرتا ہے کہ حق اور باطل، یزدان اور اہرمن، خدا اور شیطان دونوں سے تعاون کیا جائے۔

پھر آنحضرت حکومت کی خواہش مدینے ساتھ نہیں لے گئے تھے بلکہ اسے مکے میں دفن کر گئے تھے۔ چنانچہ جب سرداران قریش نے آپ کے سامنے عرب کی حکومت، دولت کے ڈھیر اور حسین لذات کو پیش کیا۔ تو آپ نے بلا توقف اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ اور کہا:۔

" اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تو بھی میں اپنے تبلیغ کے

کام سے نہ رکونگا۔ خواہ اس میں میری جان بھی چلی جائے۔"

پس جب آنحضرتؐ مدینے گئے تو محض حق کی حفاظت اور اللہ کے دین کا غلبہ پیش نظر تھا اور اس مقصد میں آپ کامیاب ہوتے۔

پادری برکت اے خاں! انسان کی آزمائش کامیابی کے بعد ہوتی ہے۔

؎ گر بہ مقصد بہ رسی مست نہ گردی مردی

آنحضرتؐ غالب آئے تو کیا آپ کی طرز زندگی، لباس، رہن سہن، خورد نوش اور انتہائی سادگی میں فرق آیا۔ کیا شاہانہ دربار سجایا گیا، حجروں کی بجائے محل تیار ہوا اور جب رحلت کا وقت قریب آیا تو کیا دنیا کو چھوڑتے وقت رفیق اعلٰے سے وصال کے سوا کوئی دوسری آرزو آپ کے دل میں تھی۔ اس کے خلاف مسیح کو نہ اقتدار نصیب ہوا اور نہ ہی یہ جانچنے کا موقع ملا کہ ان کے دل میں اقتدار اور حکومت کی خواہش نہ تھی۔ اس لئے "عصمت بی بی است از بے چادری" کے مصداق ان کی عاجزی اور حلیمی بے بسی کی دلیل تھی۔ اختیار ہی نہ تھی

آپ نے حضرت مسیح کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا ذکر کیا ہے تشکریہ! مگر آپ یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ دنیا میں مہاتما بدھ، مہاتما مہاویر، کنفیوشش اور بہت سے دوسرے بزرگوں کی تعلیمات یقیناً دلکش ہیں۔ اور ان میں سے بعض کی زندگیاں اپنی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔ مگر جہاں مسیح کی بعض تعلیمات ناقابل عمل ہیں وہاں انجیل کی رو سے آپ کا عمل تعلیمات کے خلاف

ہے ، اور ناقابل قبول بھی ۔ مثلاً آپ نے اپنی والدہ کو "اے عورت" کہہ کر خطاب کیا ۔ پھر ان سے ملنے سے انکار کر دیا ۔ ایک عقیدت مند کنعانی عورت کی یوں تذلیل کی کہ اسے اس کی بچی اور قوم کو کتا ٹھہرایا ۔ مخالفوں کو بار بار سانپ ، ریاکار ، احمق اور شاگردوں کو بُرا بھلا کہا ۔ جس کی موجودگی میں حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے ۔ اس کے برعکس آنحضرتؐ نے جو کچھ قرآن کی رو سے تعلیم دی ۔ اس پر کماحقہٗ عمل کیا ، جس کا عکس صحابہؓ کی زندگیوں پر پڑا اور وہ بہترین اخلاق کے مالک بن گئے ۔

صحابہ کرامؓ کے اختلافات

جناب نے صحابہ کرام (خلافت راشدہ) کے عہد اور بعد کے زمانے کے اختلاف پر زور دیا ہے کہ اسلام نے محض دین کے ناتے سے ترقی نہ کی بلکہ جنگوں کے ذریعے مسلمانوں کے غلبے سے اسلام پھیلا ۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد مسلمانوں کو ایران اور روم کی طاقتور سلطنتوں کے ساتھ مدافعانہ جنگیں کرنا پڑیں ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایران اور روم کے لاکھوں لشکریوں کے مقابلے میں مسلمان مجاہدوں کی تعداد ہزاروں سے کبھی آگے نہ بڑھی ۔ اور مسلمانوں کو ایک ہی وقت ان دو ۲ سلطنتوں سے ٹکرانا پڑا ۔

کچھ عرصے کے بعد اگر مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا تو اس کا سبب مجوسیوں اور رومیوں کی سازشیں تھیں ۔ جس کے وہ ماہر تھے اور اس میدان میں مسلمان ان کا مقابلہ نہ کر سکے ۔ اور وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ۔ مگر انہوں نے یہ کام اسلام کی مخالفت کر کے نہیں عربی اور

عجمی عصبیت کو ہوا دے کر کیا۔ مگر ان ملکوں میں اسلام تیزی سے پھیلا۔ کیونکہ رومی اور ایرانی ملوکیت اور استحصالی جاگیردارانہ قوتوں نے انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ اور وہ اپنی جانوں، مالوں اور آبرو کے حفاظت اور آزادی کے لئے بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کہ خلافت راشدہ نے محکوم دنیا میں حریت، امن اور عدل قائم کر کے یہ آرزو پوری کر دی۔ اور مختلف ملکوں، نسلوں اور مذاہب کے لوگ مراکش سے لیکر وسطی ایشیا تک حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ ان خلفائے اسلام کی انسان پروری کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر مدینہ سے ہزار میل دور فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے۔ تو اس کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ مصر کے ایک مسلمان حاکم نے وہاں کے ایک غیر مسلم قبطی کو بلاوجہ سزا دی تو آپ نے قبطی کی دادرسی کی اور حاکم کو کہا کہ:-

"اس کی ماں نے اسے آزاد جنا تھا۔ تم نے اِسے غلام بنا لیا"

طواف کعبہ کے دوران غسان کے حاکم جبلہ کی چادر پر ایک بادیہ نشین عرب پاؤں آ گیا تو اس نے غرور کی بنا پر عرب کے منہ پر چپت لگائی۔ حضرت عمرؓ کو پتہ تو جبلہ کو اعرابی سے معافی مانگنے یا قصاص دینے کا حکم دیا اور اس بات کی پرواہ ی کہ وہ بھاگ کر شام پہنچا اور مرتد ہو گیا ہے۔

پھر ان خلفا کے عہد میں عالم اسلام میں توحید کی صدا بلند ہو گئی۔ ایک خدا کی بادت ہونے لگی۔ قتل، بدکاری، شراب نوشی، ظلم، استحصال، چوری، لوٹ کھسوٹ

سودخوری اور دیگر مجلسی برائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ یتیموں، بیواؤں، مسکینوں، مسافروں کی غربت اور بے بسی کا مداوا ہوا۔ شہر شہر اور قریہ قریہ علم کے چشمے پھوٹ پڑے۔ اور تہذیب و تمدن کو عروج حاصل ہوا۔ اور یہی وہ آسمانی بادشاہت تھی جو آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کی بدولت دنیا میں قائم ہوئی۔ اور جس کی بشارت اور دعا حضرت مسیحؑ نے دی تھی۔

زندگی کی روحانی اور سیاسی تقسیم غلط ہے۔ انسان یا مادہ پرست ہو گا یا روحانیت پسند۔ اس میں اللہ کی نظر میں ایک ہی وقت میں شیطنت اور رحمانیت جمع نہیں ہو سکتیں۔ روحانیت روحِ انسانی کی ارتقائی کیفیت کا نام ہے۔ انسان جب انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتری کے اصولوں کو اپناتا ہے اور ضرر رساں باتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ تو وہ اخلاق و شرافت کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اور جب وہ اس سے بلند ہو کر محض اللہ کی خوشنودی کے لئے اس کے حکموں کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور انسانوں کی رضا پر خدا کی رضا کو ترجیح دیتا ہے۔ تو وہ روحانی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بدی کے تقاضوں کو کچل دیتا ہے۔ نیکی اس کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہے تو وہ حیاتِ ابدی اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا انسان زندگی کے ہر مرحلے میں روحانی ہوتا ہے خواہ وہ حاکم ہو، صاحبِ اقتدار ہو اور شہرت یافتہ ہو۔ جو لوگ زندگی کی تقسیم کرتے ہیں وہ بزدل، ابن الوقت اور زندگی سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور دنیا کی تمام برائیاں انہی کے نظریہ حیات کی پروردہ ہوتی ہیں۔ یہ میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھو، کا نظریہ ہے۔ قرآن نے یہود کی مذمت میں کہا ہے:-

"کیا تم شریعت کے بعض (مفید مطلب) حکموں پر ایمان

لاتے اور بعض (غیر مفید) حکموں کو ترک کرتے ہو۔ ایسے لوگوں
کو دنیا میں رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں سخت
عذاب ہوگا" (البقرہ)

جناب نے تاریخ کے ضمن میں بہت سی غلط، غیر مستند اور بیکار باتیں کہی ہیں۔ جن کا اسلام کی صداقت یا مسیحیت کی بھلائی سے کوئی تعلق نہیں۔

شرعی آئین کی کتاب

آپ نے لکھا ہے کہ ابتدائی دور میں مسلمان صرف قرآن پر اعتماد کرتے تھے اور تعزیرات کی کوئی کتاب نہ تھی۔ بھلا اس میں کیا خرابی تھی؟ ہمارے لیے قرآن ہی ہر شعبۂ حیات میں کافی ہے۔ آنحضرتؐ نے تمام مقدمات کا فیصلہ قرآن سے کیا۔ صحابہ کرامؓ نے قرآن کی تعلیم آنحضرتؐ سے حاصل کی، پھر وہ آنحضرتؐ کی سنت سے باخبر تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلے کرتے رہے۔ لیکن جب سلطنت وسیع ہوگئی اور صحابہ کم ہوتے گئے تو ان ہی بزرگوں کی رہنمائی میں فیصلے کتابی صورت میں آتے گئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے فیصلہ جات تحریر میں آئے۔ ملک بھر کے قاضی ان کی روشنی میں فیصلے کرتے رہے۔ حتیٰ کہ صحابہؓ کے آخری ایام میں امام ابوحنیفہؒ نے اس وقت کے معروف علما کی مدد سے فقہ کی تدوین کی۔ جسے عباسی خلفا نے اپنی سلطنت میں رائج کیا اور ان کے شاگرد اور رفیق قاضی ابو یوسف عباسی خلافت میں قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ اس کے بعد فقہ کی دوسری کتابیں مدوّن ہوئیں۔ مگر مسلمان ہر دور میں قرآن کے مطابق قوانین وضع کر سکتے ہیں۔ اور قرآن

ہمیشہ کے لئے مکمل اور محفوظ ہے۔ اور یہ امرھم شوریٰ بینھم کے عین مطابق ہے۔

اسلام اپنی اشاعت کے لئے کسی فقیہہ کا محتاج نہیں۔ اسلام کی تعلیمات تو قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ قرآن حکیم نے دنیا کے دل پہلے بھی جیتے اور اب بھی، وہ دلوں کو فتح کر رہا ہے۔ قوانین سے دل نہیں جیتے جاتے، قوانین تو بدی سے روکنے کے لئے خارجی ذریعہ ہیں۔ دلوں کو تبدیل نہیں کرتے۔ زندگیوں میں تبدیلی ایمان سے آتی ہے۔ اور مومن محض اپنے ایمان کے زیرِ اثر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اس کے حکموں پر عمل کرتا اور بدیوں سے بچتا ہے۔

انجیل نویس

آپ لکھتے ہیں کہ "انجیل نویس حضرت مسیحؑ کی تکلیف کے ہر لمحے ان کے ساتھ تھے۔" آپ کا یہ دعویٰ بلا دلیل و بے حوالہ ہے۔ انجیل کی رو سے ایک بھی انجیل نویس نہ مسیح کا شاگرد تھا نہ آپ کے ساتھ موجود تھا۔ نہ اس نے مسیح کو دیکھا تھا۔

آپ انجیل کے حوالے سے بتائیے کیا دو انجیل نویسوں مرقس اور لوقا کا نام مسیح کے شاگردوں میں تھے (اعمال)، متی کوئی دوسرا شخص تھا یا مسیح کا خاص شاگرد (متی ۹:۹) یوحنا مسیحؑ کا شاگرد تھا یا بعد کا کوئی شخص (یوحنا ۲۱:۲۴) پھر مکتوب سے بھی واضح ہے کہ رسولوں نے کوئی انجیل نہ لکھی، ورنہ وہ اپنے اناجیل مختلف شہروں کو بھیجتے یا ان کا ذکر ہی کر دیتے۔

ویسے مسیح کے شاگرد بھی مسیحؑ کی گرفتاری کے بعد ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

ایک نے گرفتار کروا کر خودکشی کرلی ۔ دس ایسے نکلے بھاگ گئے کہ آپ کے بچ نکلنے کے بعد مسیح نے انھیں خود تلاش کیا ۔ بارہویں شاگرد پطرس نے پہلی ہی رات ان کا تین بار لعنت کے ساتھ انکار کیا اور پھر بھاگ گئے ۔ صلیب کے وقت کوئی شاگرد موجود نہ تھا ۔ دلائل کے ساتھ وضاحت کیجیے ۔ دعویٰ بلا دلیل کمزوری کی علامت ہے اور بار بار جھوٹ بولنے سے جھوٹ جھوٹ ہی رہتا ہے ۔ سچ نہیں ہو جاتا ۔ آخر جھوٹ بول کر آپ اپنے ضمیر کو کیسے مطمئن کر لیتے ہیں

درس سوم

غلط بیانیوں کا پلندہ

پادری صاحب نے حصہ سوم میں مسیح کی ابنیت، الوہیت، تجسیم کلام کے مشرکانہ عقائد کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے یہاں ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اللہ کی ذات اور صفات میں شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دیا ہے۔ اگر ابنیت سے مراد یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اور مریم میں میاں بیوی کا تعلق تھا۔ تو ہم اس عقیدے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ اور اگر یہ روحانی ابنیت ہے تو پھر تمام مخلوق بالخصوص اللہ کے تمام نیک بندے ابناء اللہ ہیں۔ مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بالخصوص جبکہ آپ ایک عورت کے رحم میں ۹ ماہ رہ کر پیدا ہوتے۔ اور بچپن اور جوانی کے مراحل میں سے گزر کر کوئی بچاس سال کی عمر میں مصلوب ہوئے۔ (انجیل کی رو سے وہاں کے بزرگوں کی یہی شہادت ہے) آپ کھانے، پینے، پہننے کے محتاج تھے۔ جان بچانے کے لئے بیابان میں پناہ لیتے تھے۔ غیب سے بے خبر تھے، موت کے تصور سے کانپتے تھے اور رو رو کر بچنے کی دعائیں مانگتے تھے اور آخر صلیب پر خدا کو پکار کر بیہوش ہو گئے۔ اور تندرست ہونے پر باغبان کا بھیس بدل لیا اور موت کا خوف اس قدر حاوی ہوا

کہ اپنا کام نامکمل چھوڑ کر غائب ہو گئے اور جلدی آنے کا وعدہ کر کے دو ہزار سال سے مسیحی دنیا کو انتظار میں رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا شخص خدا کیسے ہو سکتا ہے۔

بائبل کتابِ مقدس

جناب لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی سچی آسمانی کتاب مقدس موجود ہے تو وہ ہے یہ بائبل مقدس۔"

اور اس کتابِ مقدس میں لکھا ہے کہ:۔

"بزرگ نوحؑ نے شراب پی، بزرگ لوطؑ کی بیٹیوں نے باپ سے زنا کر کے اپنے بھائی پیدا کر لئے۔ بزرگ یعقوبؑ نے ایک وقت میں دو بہنوں سے شادی کی، بزرگ داؤدؑ نے اوریاہ کی بیوی کو نہاتے دیکھ کر منگوا لیا۔ اور اس کے خاوند کو قتل کروا کر اسے حرم میں ڈال لیا سلیمانؑ نے بیوی کی خاطر بت پرستی اختیار کر لی۔ مسیح نے اپنی والدہ کی بے عزتی کی، ایک فاحشہ عورت سے سر پر عطر ڈلوایا اور اس عورت نے جناب کے پاؤں کو اپنے نرم ہاتھوں اور ملائم بالوں سے صاف کیا۔"

اگر کتابِ مقدس اسی کا نام ہے تو پھر مسیحی دنیا کی اخلاقی حالت کیسے بلند ہو سکتی ہے؟ پھر یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابِ مقدس میں فرق ہے اور دو مسیحی فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی کتابِ مقدس بھی ایک دوسری سے کم و بیش ہے:۔

قرآن پر لچر اعتراض

پادری صاحب! یہ تو مانتے ہیں کہ بائبل نزول سے پہلے خدا کے علم اور ارادے میں موجود تھی۔ اور پھر موسوی شریعت خدا نے تختیوں پر لکھ کر موسےٰ کو عطا کی، مگر خدا کے علم اور ارادے کو لوحِ محفوظ تسلیم نہیں کرتے۔ ویسے جبریل قرآن کو کاغذ پر لکھ کر نہیں لاتے تھے۔ وحی کا نزول (نزلہ علی قلبک) آنحضرتؐ کے قلب اطہر پر ہوتا تھا۔ آپ نے لکھا ہے کہ مسلمان قرآن کو غیر مخلوق مانتے ہیں۔ یعنی کلام صفتِ خداوندی ہے۔ اس کا اللہ کی ذات سے الگ کوئی وجود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ بعض باتوں کو سمجھانے کے لئے انسانی علم اور فہم کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ تاکہ انسان آسانی سے سمجھ لے، ان باتوں کا سرچشمہ ارادہ الٰہی، علم خداوندی اور اس کی صفت کلام ہے۔

لال بجھکڑانہ استدلال

آگے لکھتے ہیں۔ " قرآن مجید کے مطالعہ سے قرآن کا ہر لفظ خدا کا کلام ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اللہ کے علاوہ بعض مخلوق ہستیاں بھی ہیں۔ جن کا کلام قرآن میں موجود ہے۔ اور ان پر بھی وحی کے نزول کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً عمران کی عورت پر وحی نازل ہوئی، مریم کا کلام، زکریا کا کلام، نمرود کا کلام، فرعون کا کلام — الخ"

کیا خوب استدلال ہے۔ اسطرح تو آپ کی بائیبل بھی خدا کا کلام نہیں۔ عہد نامہ جدید میں شیطان کا کلام، فریسیوں کا کلام، چرواہوں کا کلام، راہی گیروں کا کلام، خنزیروں کا کلام، یہوداہ اسکریوتی کا کلام، پیلاطوس کا کلام، چوروں کا کلام وغیرہ وغیرہ موجود ہے۔ تو کیا یہ کتاب مقدس نہ رہی۔ اگر آپ

ایک کتاب لکھیں اور اس میں دوسروں کے اقوال درج کریں تو کیا وہ آپ کی کتاب نہ رہے گی؟ اگر اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب نازل کرے اور اسمیں اقوام اور افراد کی باتوں کا ذکر کرے تو کیا وہ خدا کا کلام نہ رہے گی؟ یہ تو کوئی نہیں کہے گا کہ اب یہ مریم کی کتاب، عمران کی کتاب، حواریوں کی کتاب بن گئی۔ آپ کے قول کے مطابق مذہب میں حکمت، عقل و دانائی کو بھی دخل ہے۔ لیکن آپ نے تو قرآن کو خدا کا کلام نہ ثابت کرنے کے لئے حکمت، عقل و دانائی کو الگ رکھ دیا ہے۔ ایسی بات تو روانتی لال بجھکڑ نے بھی کبھی نہیں کہی۔ رہی انجیل کی رو سے مسیح کی حکمت و دانائی، تو اس کا جتنا کم ذکر کیا جائے بہتر ہے۔ ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اگر آپ کی نظر میں قرآن آنحضرتؐ کا کلام ہے تو پھر آنحضرتؐ کو فوق البشر ہستی تسلیم کرنا پڑے گا۔ جن کا علم کائنات کی ہر شے پر وسیع تھا۔ اور آپ تخلیق کائنات سے لے کر قیامت اور اس کے بعد کے واقعات پر کامل نظر رکھتے قرآن میں تخلیق عالم، اقوام جہاں کے عروج و زوال، سابق انبیاء، مشہور سلاطین دہر، بزرگان اقوام، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل، شیطان و آدم، فرشتوں اور خدا کا مکالمہ، ذوالقرنین، اصحاب کہف، اصحاب اخدود، لقمان، اور دیگر لاتعداد باتوں کا علم ہے۔ اس میں آئندہ کے متعلق پیشگوئیاں ہیں جو پوری ہوئیں، ہو رہی ہیں اور ہوں گی۔ اور اسی قرآن سے آپ کو مسیح کی حقیقی عظمت کا بھی علم ہوتا ہے۔ پھر آنحضرت صلعم کی عظمت کا اس بات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن

میں مذکورہ تمام ہستیوں کی زبانیں جانتے تھے۔ تبھی ان کے اقوال قرآن میں درج کیئے ورنہ یہ مختلف قوموں اور ملکوں کے افراد عربی زبان سے ناواقف تھے۔ اور اگر یہ تمام امور آنحضرتؐ کی رسائی سے باہر تھے تو پھر تسلیم کرنا ہو گا کہ قرآن علیم، خبیر اللہ تعالےٰ کا ہی کلام ہے۔ فھل من مدکر۔

خُدا کی زبان

آپ کا یہ اندازِ تحقیق درست نہیں کہ فلاں مسلمان یہ کہتا ہے اور فلاں مولوی کا یہ بیان ہے۔ حق پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بتایئے مسلمانوں کی واحد آسمانی دینی کتاب کیا کہتی ہے۔ ایسے ہی کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی عام مسیحی، کسی پادری یا کسی مسیحی فرقے کی رائے پر انحصار کر کے مسیحیت پر تنقید کرے۔ بلکہ اسے بائبل اور بالخصوص اناجیل مقدسہ کو ہی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

قرآن نے کہیں بھی نہیں لکھا کہ اللہ کی زبان صرف عربی ہے۔ قرآن کی رو سے عرب سے باہر بھی تمام دوسری اقوام میں خدا کے فرستادہ نبی آئے، جنہوں نے اپنی اپنی قوم کی زبان میں اللہ کا پیغام پہنچایا۔

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں" (ابراہیم)

گویا کہ اللہ نے دنیا کی تمام زبانوں کو تسلیم کیا۔ اور ہر قوم اور فرد کے لیئے دین کا فہم آسان کر دیا۔ مگر انبیاء کی بنیادی تعلیم توحید، نیکی، فلاحِ انسان، اعمال کی جزا و سزا اور خدا شناسی اور اس کی رضا کا حصول چونکہ تمام نوعِ بشر کے لیئے تھا۔ اس لیئے رسول کی تعلیم کو دوسروں تک پہنچانے پر پابندی نہ لگائی سوائے اس پابندی کے

جو کسی نبی نے ضروری سمجھی۔ جیسا کہ مسیحؑ نے فرمایا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو اکٹھا کرنے آیا ہوں۔

چونکہ آنحضرتؐ کے مخاطب عرب تھے۔ اس لیے قرآن عربی میں نازل ہوا۔ اگر آپؐ ایران میں پیدا ہوتے تو یقیناً کلام الٰہی فارسی زبان میں اترتا۔ البتہ تمدنی تقاضوں کے پیش نظر مختلف زبانوں کی اظہار مدعا کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ جو ملک دنیا کے تہذیبی مرکزوں سے دور ہیں اور انہوں نے علوم و فنون میں ترقی نہیں کی ان کی زبانوں کا ذخیرہ محدود رہتا ہے۔ اور وہ ارفع و اعلیٰ خیالات کو کما حقہٗ بیان نہیں کر سکتے۔ مسلمان جب عربی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں تو ان کی یہی مراد ہوتی ہے۔ زبانوں کی اس خصوصیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کو کونسی بات مانع ہے۔ ویسے اللہ کے ہاں تمام زبانیں مفید مطلب ہیں۔

مسلمانوں میں قرآنی تراجم کے بارے میں اختلاف نہیں۔ اور اس ترجمے کا نتیجہ تھا کہ چند سالوں میں اسلام غیر عرب قوموں میں پھیل گیا۔ چنانچہ ابتدائی زمانے ہی سے قرآن کے تراجم کیے جا رہے ہیں۔ فارسی میں شیخ سعدی شیرازیؒ اور مولانا عبداللہ ہراتیؒ کے فارسی کے تراجم و تفاسیر صدیوں پہلے کی گئیں۔ اسی طرح صدیوں پہلے سندھی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

پھر برصغیر میں اڑھائی سو سال پہلے شاہ ولی اللہؒ نے فارسی میں ترجمہ کیا اور ان کے بعد شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اردو میں ترجمہ اور تفسیر شائع کی اور اب تو صرف پاکستان میں بیسیوں ضخیم تفاسیر موجود ہیں۔ اور قرآنی تعلیمات پر قرآنی آیات کی روشنی میں جو کتب شروع ہی سے تحریر کی گئی ہیں ان کی تو انتہا ہی

کوئی نہیں۔ البتہ متن کے بغیر ترجمہ کی خرابی یہ ہے کہ لوگ ترجمے ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہیں۔ اور جب کوئی عالم ترجمے کی غلطی پکڑتا ہے۔ تو لوگ اس سے لڑنے لگتے ہیں۔ انہی سالوں میں انجیل کے ریوائزڈ سٹینڈرڈ ایڈیشن میں پہلے تراجم سے کئی مقامات پر اختلاف کیا گیا ہے۔ اس لیے تراجم نہ تو ہر جگہ اصل کے ترجمان ہو سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کو اصل کا سا احترام دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان علماء متن میں تو اختلاف نہیں کرتے۔ مگر ترجمہ کو ہمیشہ تنقید کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

البتہ بعض علماء نے ترجمہ کی مخالفت کی ہے ان کا موقف یہ رہا ہے کہ کسی دوسری زبان میں قرآنی عربی کا مفہوم ادا کرنے کی کما حقہٗ صلاحیت نہیں۔ اور اگر لوگوں نے قرآنی تعلیمات کی وسعت کو تراجم تک محدود کر لیا تو وہ آہستہ آہستہ حقیقت سے دور جا پڑیں گے۔

اور یہ ایک حقیقت ہے۔ اسی لیے تراجم کی کمزوری کو تفاسیر سے پورا کیا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میں قرآنی آیات کو عربی زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ تاکہ اول تو کلام الٰہی کا مفہوم ہر دور میں یکساں برقرار رہے۔ امت میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ ورنہ نماز میں تکبیروں، تسبیح اور سورہ فاتحہ (جو قرآن کی روح ہے) کے سوا اپنی زبان میں دعائیں مانگنے کی کہیں مخالفت نہیں۔ خاص کر سنتوں، نوافل اور تہجد میں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان اپنی زبان میں دعائیں مانگتے ہیں۔ ویسے ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نماز اور دیگر دینی تعلیمات کا مطلب سمجھ لیا جائے تو یہ ضروری بھی ہے اور ممکن بھی ہے۔ مسیحیوں نے تراجم پر انحصار کیا۔ صحیح یا غلط کو نہ دیکھا۔ اس لیے اصل متن گم کر بیٹھے۔ حضرت مسیحؑ نے جو کچھ بتایا ادا کی

زبان میں جتایا۔ انجیل نویسوں نے یونانی میں درس کا ترجمہ ہی کیا۔ اصل کو ترک کر دیا۔ اسلیے آج یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ ترجمہ غلط ہے یا درست۔ اور آج تو پہلے ترجمے کا ہر نیا ترجمہ پہلے سے اختلاف کرتا ہے۔ چنانچہ نیلسن نے اپنی کتاب "نجوم امُبّن" میں ترجمے کی تبدیلی کی سینکڑوں مثالیں دی ہیں۔ اس لیے آپ موجودہ صورت پر عقیدے کی بنا پر مطمئن تو ہو سکتے ہیں، حقیقت کو پا نہیں سکتے۔ حکیم نطشے نے اپنی بہن سے کہا تھا "اگر تمہیں تسکین کی ضرورت ہے تو گرجا میں جاؤ۔ اور اگر حق کی تلاش ہے تو میرے پاس آؤ۔"

آپ کا یہ کہنا درست نہیں کہ ارامی کو یونانی سے وہی نسبت ہے جو پنجابی کو اردو سے ہے۔ حالانکہ ارامی کو یونانی سے وہی نسبت تھی جو انگریزی کو اردو سے ہے۔ اس لیے جس طرح انگریزی پنجابی سے ملتی جلتی نہیں، اسی طرح یونانی، ارامی سے بہت مختلف تھی۔ پھر یہودیوں کو تو ارامی اور یونانی زبانوں سے نفرت تھی۔ اور مسیحؑ کے شاگرد معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان میں تو تمثیلیں سمجھنے کی بھی صلاحیت نہ تھی۔ اور مسیحؑ انہیں اکثر ڈانٹتے رہتے تھے انہیں بیماروں کو درست کرنے بھیجا تو وہ ناکام رہے۔ ان میں نہ تو کچھ لکھنے کی صلاحیت تھی اور نہ ہی انہوں نے کچھ لکھا۔ اور بعد میں جنہوں نے کچھ لکھا، انہوں نے سن سنا کر متفرق اقوال اور باتیں لکھیں۔ اس طرح نہ تو تمام باتیں یونانی میں منتقل ہوئیں اور نہ ہی تمام تعلیم محفوظ رہی۔ اور گو انجیل نویسوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا، لیکن پھر بھی ان کی معلومات میں بہ کثرت تعداد موجود ہے جنہیں مسیحی علماء وقتاً فوقتاً درست کرتے رہتے ہیں اور مزید

الحاد اور تفرقہ پیدا کرتے ہیں۔

سامانِ کتابت

آپ لکھتے ہیں کہ اسلام سے چھ سو سال بلکہ اس سے بھی قبل یہودیوں اور دوسری قوموں میں لکھنے کا سامان موجود تھا۔ اور ان کے نوشتے پیپرس کاغذ پر موجود ہیں۔ مگر مقام حیرت ہے کہ اسی ماحول کے عربوں کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ پتھروں، ہڈیوں، پتوں پر لکھا کرتے تھے۔ یہ اس مجوسی سازش کا حصہ اور پروپیگنڈہ ہے جس نے عربوں کو اُمی یعنی ان پڑھ اور جاہل مشہور کر رکھا ہے۔ درست یہی ہے کہ عرب بالخصوص قریش لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مدینہ کے یہودی علماء میں لکھنے پڑھنے کا عام رواج تھا۔ مسلمان قرآن لکھتے تھے۔ اور سامان کتابت رکھتے تھے۔ مدینہ میں میثاق مدینہ تحریر ہوا۔ انہوں نے مختلف قبائل سے عہد نامے کیے، سلاطین کو خطوط لکھے۔ اس لیئے پتھروں اور ہڈیوں پر لکھنے کا الزام احمقانہ جہالت ہے۔

نجات

ہر مذہب انسان کو نجات دلانے کا مدعی ہے۔ مسیحیت کی رو سے انسان پیدائشی گنہگار ہے۔ اس لیئے اس کی نجات کے لیئے خدا نے اپنا بیٹا قربان کیا۔ اب نجات کے لیئے اسی قدر کافی ہے کہ مسیح کی مصلوبیت پر ایمان لایا جائے۔ اس نظریہ کا حامی پولوس بتایا جاتا ہے۔ مگر حضرت مسیحؑ کی ایسی کوئی تعلیم نہیں ملتی، بلکہ ان کے مطابق نجات پانے کے لیئے ضروری ہے کہ خدا کی توحید اور حضرت مسیحؑ کی رسالت پر ایمان لایا جائے اور آپ کی تعلیمات پر کماحقہٗ عمل کیا جائے۔ اور اپنی خواہشات، رضا اور ارادوں کو

خدا کے حکموں کے ماتحت کر کے زندگی بسر کی جائے۔ اس طرح انسان خدا کی بادشاہت میں داخل ہو کر نجات حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن حکیم نے بھی نجات کے لیئے اللہ کے حکموں کی کامل پیروی کو لازم ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ جب انسان بدیوں سے بچتا اور خدا کے حکم کے ماتحت پاکیزہ زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اللہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے تب اسے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ رضائے الٰہی کی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اسے فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کا مژدہ سنایا جاتا ہے۔ اور سب مفہوم اسلام کے لفظ میں موجود ہے۔

قرآن حکیم میں انبیاء کے حالات

پادری صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں نبیوں کے متعلق غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ اور اس ضمن میں انہوں نے بعض باتوں کی طرف اشارات کیئے ہیں جن پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن حکیم تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس نے اول تو سب نبیوں کا ذکر نہیں، بلکہ زیادہ تر ان نبیوں کا نام لے کر تذکرہ کیا ہے۔ جن کی امتیں اس وقت موجود تھیں یا ان امتوں کے آثار اور انبیاء کی تعلیم کا ذکر موجود تھا۔ اس لیئے قرآن نے ان انبیاء کی تعلیمات اور ان کی امتوں کی حسنات و سیئات اور ان کے اثرات کا ذکر کیا جس سے مقصد مسلمانوں کے قلوب کو مضبوط کرنا اور مخالفین حق کو پہلے نبیوں کی امتوں کے برے انجام سے متنبہ کر کے انہیں اسلامی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔

تاریخی لحاظ سے اسلام سے قبل انبیاء کے مستند حالات کا کوئی ذریعہ نہیں۔
چنانچہ یہودیوں کی تاریخ ان کے انبیاء کے حالات اور دینی تعلیمات کو یہود کے
بخت نصر کے عہد میں پہلی بربادی کے بعد چوتھی صدی قبل مسیحؑ میں عزرا نبی کی
نگرانی میں ضبط تحریر میں لایا گیا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کے کوئی دو ہزار سال بعد
اب کوئی دانشمند بتائے کہ جو واقعات اپنے وقوع سے صدیوں بعد
لوگوں سے سن کر لکھے گئے ہوں ان کے ناموں، واقعات کی تاریخوں، تعلیمات
وغیرہ کی صحت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی کسوٹی پر قرآنی معلومات کو
پرکھا جائے۔

چنانچہ ان کتابوں میں قریب ترین عہد نامہ جدید ہے۔ اور بدقسمتی سے ان
اناجیل کی تعلیمات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ جن سے اناجیل کی صحت پر یقین نہیں
کیا جا سکتا۔ کہ ان کے مقابل قرآن کی تغلیط کی جا سکے۔ اور قرآن کی صحت پر
واقعات کی ایک زبردست شہادت یہ ہے کہ مراکش سے لے کر وسط ایشیا تک
لاکھوں عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں، صابیوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں نے
قرآنی ناموں، واقعات اور تعلیمات کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لا کر واقعات
قرآن کی تائید و حمایت کی۔

ان حقائق کے بیان کے بعد ہم، جناب پادری صاحب کے اعتراضات کو
لیتے ہیں کہ ان میں کس قدر معقولیت پائی جاتی ہے۔

اعتراض بزرگ ابراہیم کے باپ کا نام تارح تھا۔ قرآن نے الیعزر یعنی
آذر لکھا ہے۔

وضاحت

پادری صاحب کو کسی تاریخی کتاب سے اس کا ثبوت ملا۔ اگر بائبل سے یہ لفظ لیا ہے۔ تو بائبل کی صحت کا کیا ثبوت ہے۔ کتاب پیدائش تو ابراہیم سے کوئی دو ہزار سال بعد عزرا نبی نے لکھوائی۔ اس کے پہلے زمانے کی کون سی تاریخ تھی۔ اور اگر یہ تاریخ دو ہزار سال تک سینہ بہ سینہ چلتی رہی اور اس میں سے حضرت یوسف اور موسیٰ کے درمیان چار سو سال کی تاریخ بالکل ہی غائب ہو تو اس کو درست کیونکر مانا جاتے۔ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ چند ہی سال پہلے کے واقعات اور نام وغیرہ لکھتے وقت سہو و نسیان کی کئی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ پھر عرب بھی اسماعیلؑ کے واسطے سے ابراہیم کی اولاد تھے اور وہ علم انساب کے ماہر تھے۔ ان کا قرآنی نام کو قبول کرنا زیادہ مستند ہے۔ ویسے بعض علماء اسلام نے آذر کو ابراہیمؑ کا چچا تصور کیا ہے۔ اور تارح کو باپ۔ ان کے خیال میں عربی زبان میں چچا کو بھی باپ کہنے کو درست مانا جاتا ہے۔ مگر اس کی تائید کسی تاریخ سے نہیں ہوتی اس لئے آذر ہی ابراہیمؑ کے والد کا نام ہے۔

اعتراض

"مریم مقدسہ کے باپ کا نام تو عیلی تھا۔ مگر قرآن میں عمران لکھا ہے۔ جو ہارون اور موسیٰ اور ان کی بہن مریم کا باپ تھا۔ قرآن کے جبرئیلؑ کو یہ خبر نہ تھی کہ عیسیٰ المسیح کی والدہ کون سی مریم تھی؟"

وضاحت

کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ عہد نامہ جدید کا وہ حوالہ بھی درج کر دیتے جس میں مریم کے والد کا نام عیلی لکھا ہے۔ اور اگر اناجیل میں یہ نام موجود نہیں تو ہمارے لئے آپ سند نہیں ہو سکتے۔ ویسے قرآن سمیت دینی کتابوں کا اسلوب ہے۔ کہ وہ کسی فرد کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی نسبت

بزرگوں میں سے کسی ایک سے ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ انجیل میں یسوع کو مسیح ابن داؤد لکھا گیا ہے (انجیل متی) حالانکہ انجیل میں ان کے والد کا نام کئی جگہ ابن یوسف نجار لکھا ہے۔ اگر مسیح صدیوں کے وقفے کے ہوتے ہوتے ابن داؤد، ابن ابراہام اور ابن آدم ہیں تو خاندان موسیٰ اور ہارون کے جد امجد اور مریم کے نسبتی بزرگ مریم کے باپ کیوں نہیں ہو سکتے جبکہ مریم ان کی نسل سے تھیں۔ پھر عمران کی بیٹی ہونے کے ناتے سے وہ ہارون کی بہن ٹھہریں اور چونکہ ہارون کی طرح اسرائیل کی عبادات و رسول کی رہنمائی مریم کے خاندان میں تھی اور انہیں ہیکل کی نذر کر دیا گیا تھا۔ اس لئے انہیں موسیٰ کی بہن کہنے کی بجائے ہارون کی بہن کہنا ہی مناسب تھا۔ اور مریم کی عظمت کا تقاضا یہی تھا۔ اسی نسبت سے انہیں بنتِ عمران اور اختِ ہارون (ہارون کی بہن) بتایا گیا ہے۔ یہ تاریخی غلطی نہیں دینی اسلوب ہے۔ اور مریم جیسی مقدس کو کسی غیر معروف عیلی سے منسوب کرنے سے عمران اور موسیٰ اور ہارون سے منسوب کرنا کہیں زیادہ مناسب اور باعثِ شرف ہے۔ قرآن کے جبریل کو مریم کے ارفع مقام کا زیادہ احساس تھا۔ اس لئے اس نے عیلی کی بجائے موسیٰ، ہارون اور عمران سے نسبت دے کر مریم کو مقام رفعت و عظمت پر بٹھا دیا۔ اور روحانی دنیا میں مسیح کی نسبتی کمزوری کی پردہ پوشی کی۔

اعتراض قرآن میں لکھا ہے کہ مسیح کی پیدائش کھجور کے درخت کے نیچے ہوئی۔ حالانکہ بیت لحم میں ہوئی، مکان کے اندر ہوئی۔"

وضاحت پیدائش مسیح سے متعلق انجیل اور مسیحی دنیا میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ انجیل متی کی روایت ہے کہ یسوع

ہیرودیس بادشاہ کے زمانے میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا" (متی ۲: ۱)
یہاں یہ ذکر نہیں کہ بیت لحم میں کس کے ہاں یسوع پیدا ہوتے۔ ان کا اپنا گھر یہاں نہ تھا۔ کیونکہ مریم ان دنوں اپنے منگیتر یوسف نجار کے ساتھ گلیل کے شہر ناصرہ میں رہتی تھی۔ (لوقا ۱: ۲)

یوسف مریم کے ساتھ مردم شماری میں نام لکھانے بیت لحم آیا۔ یہاں بقول انجیل لوقا مریم کا پہلوٹھا بیٹا یسوع پیدا ہوا۔ اور اس نے اس کو کپڑے میں لپیٹ کر چرنی میں رکھا۔ کیونکہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی (۲: ۷) اور فرشتے نے اس واقع کی اطلاع اس علاقے میں چرواہوں کو دی جو رات کو میدان میں رہ اپنے گلہ کی نگہبانی کر رہے تھے (۲: ۸) لوقا کی روایت کے لحاظ سے مسیح کسی مکان میں پیدا نہ ہوتے۔ بلکہ انہیں کسی سرائے میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملی۔ اور مجبوراً انہوں نے بچے کو چرنی میں ڈال دیا۔ چرواہوں کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مریم آبادی سے باہر تھیں۔ چرواہوں کے سوا کوئی قریب نہ تھا ورنہ فرشتہ بستی والوں کو اطلاع دیتا۔ صرف چرواہوں کو بتانے میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ پھر بیت الحم میں سردیوں میں بہت سردی پڑتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات برف باری بھی ہو جاتی ہے۔ مگر گرمی کی وجہ سے چرواہے اور ان کے مویشی کھلے میدان میں تھے۔ اور بچے کو چرنی میں رکھ دیا گیا تھا۔ جو پیدائش کے وقت موسم گرما کی علامت ہے۔ اور اس بات کی تردید کرتی ہے۔ کہ مسیح ۲۵ دسمبر کو عین سردیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اس بات کی شہادت ہے کہ عیسائی کرسمس کا دن غلط وقت پر مناتے ہیں۔ اس صورت میں قرآن کی شہادت لیجیے کہ "درد زہ

مریم کو کھجور کے تنے کی طرف لے گئی"۔ یعنی انہیں سایہ، اوٹ اور پانی کی طرف لے گئی۔ یہ جگہ یقیناً بستی کے قریب تھی، جہاں کھجور کا باغ تھا۔ کھجور کا موسم تھا اس لیے باغ میں کھجوریں، پانی، سایہ اور پردہ میسر آیا۔ چرواہوں کی موجودگی بھی بستی سے قرب کی علامت ہے۔ یہ جگہ بستی سے قریب مگر باہر تھی۔ جہاں زندگی کی دوسری سہولتیں مہیا نہ تھیں۔ آنحضرتؐ کے زمانے کے یک فطرت مسیحوں کا ان باتوں پر ایمان لانا بھی ہماری تائید کرتا ہے۔

اعتراض قرآن مسیح کی صلیبی موت کا انکار کرتا ہے۔

وضاحت قرآن مسیح کی صلیبی موت کا انکار کرتا ہے اور یہ اس کا مسیحیت پر بہت بڑا احسان ہے۔ پادریوں نے اپنی دوکان چلانے کے لیے ایک عظیم نبی کو لعنتی موت مرنے کا ڈھونگ رچایا۔ ہم مسیح کو خدا کا ایک برگزیدہ نبی مانتے ہیں اور اس بات کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ یہودیوں اور مسیحیوں کی ایک نکردہ سازش کو کامیاب ہونے دیں کیونکہ اللہ کے نبی غالب ہوتے آئے ہیں نہ کہ مغلوب۔ اس صورت میں حق پر دنیا کا اعتماد ہی اٹھ جاتا۔ ہم پادری صاحب سے توقع کریں گے کہ وہ یہود کی نظر میں مسیح کو لعنتی موت نہ مرنے دیں اور مسیح کو سچوں اور راست بازوں کے دائرے سے نکال کر لعنتیوں کے دائرے میں شامل نہ کریں۔ ورنہ جناب خود لعنتی ہوں گے۔

اعتراض قرآن مسیح کی الٰہی ابنیت کا انکار اور خدا کی زوجہ کا سوال پیدا کرتا ہے۔

وضاحت

جب جناب کسی کا بیٹا قرار دیں گے تو پھر زوجہ تو بنانا پڑے گی۔ قرآن نے اس بات کی تردید کی ہے۔ کہ مریم یا کوئی دوسری خاتون (نعوذ باللہ) اللہ کی زوجہ تھی۔ اور جب خدا کی زوجہ نہیں تو بیٹا کیسے ہوگیا۔ اور جب بیٹا نہیں تو پھر مسیح کی الوہیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر مسیح کو خدا کا حصہ بنانا ہے تو پھر مریم کو درمیان سے نکالیے اور خدا کو بیٹا جننے کے لئے مریم کا محتاج نہ بنایئے۔

حضرت مسیح کی تمام زندگی ایک انسان کی طرح گزری، ویسے اللہ تعالےٰ کو اپنی مخلوق بالخصوص نیک انسانوں سے محبت ہے۔ اس لئے اس نے عہد نامہ عتیق و جدید میں کئی ایک نیکو کاروں کو اپنا بیٹا کہا ہے۔ مسیح کی اس میں تخصیص نہیں اور لفظوں کا یہ مجازی استعمال زبان کا حسن اور تعلق کی شدت کا مظہر ہے۔ اور عیسےٰ ابن مریم بھی، دوسروں کیطرح محض مجازی ابن اللہ تھے۔ ہم کسی انسان کو شیر کہتے ہیں تو یہ مجازی نسبت ہے۔ محض ایک صفت شجاعت کی بنا پر، ورنہ اس انسان کو شیر کے دانت، پنجے، دم اور ٹانگیں نہیں لگ جاتیں، کیا مسیح انسان سے ملتے تھے یا زمین و آسماں کے خالق خدا کے مشابہ تھے۔ قرآن نے آپ کو عقل اور حقیقت کی راہ بتائی ہے۔ ممنون احسان کیوں نہیں ہوتے؟

اعتراض

مسیح خداوند کی الوہیت کا انکار

وضاحت

مسیح میں الوہیت کہاں سے آگئی۔ جب وہ پیدا نہیں ہوئے تھے تو خدا کی خدائی چل رہی تھی اور ان کے رخصت ہو

جانے کے بعد بھی چل رہی ہے۔ وہ تو خود دکھوں اور مصیبتوں میں پھنسے رہے۔ اور اناجیل کے مطابق وہ طویل عاجزانہ دعاؤں کے باوجود ذلت و خواری کے مراحل سے گزرے اور مایوس ہو کر اپنے شاگردوں سے دعا کی التجا کرتے رہے۔ کیا یہ الوہیت کے کام ہیں۔ اور اگر الوہیت اسی کا نام ہے تو پھر مختلف اقوام نے جن لوگوں یا اشیاء میں خدائی صفات مانی ہیں ان کے خلاف کوئی دلیل نہیں رہتی۔ اور الوہیت وانیت مسیح کے مقابلے میں وہ لوگ کم غیر معقول ہیں جنہوں نے اپنے بزرگوں کو خدا کا اوتار مان رکھا ہے۔ اس طرح کم از کم خدائی کے حصے بخرے تو نہیں ہوتے۔ خدا ایک ہی رہا۔ مسیح اللہ کے نیک بندے اور رسول تھے۔ دوسرے نبیوں کی طرح ان پر خدا کا فضل تھا۔ انہوں نے اللہ کا پیغام دنیا تک پہنچایا۔ اس مقصد کے لیئے دکھ اٹھائے۔ اور جب خدا نے چاہا دنیا سے اٹھا لیا۔ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے۔

اعتراض ایک دفعہ عرب کے نجران قبیلہ کے مسیحی حضور صلعم کے پاس آئے اور ان سے سوال کیا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں۔ تو پھر آپ نے یہ بات کیوں فرمائی ہے۔ کہ عیسیٰ المسیح کی والدہ مریم مقدسہ عمران کی بیٹی تھی اور وہ ہارون کی بہن تھی۔ کیونکہ عیسیٰ المسیح کی والدہ مریم اور عمران کی بیٹی مریم کے زمانہ حیات میں قریباً ڈیڑھ ہزار سال کا فرق ہے۔ جس سے ناراض ہو کر حضور نے فرمایا اگر تم سچے ہو تو میرے ساتھ مباہلہ کر لو۔ نجران کے مسیحیوں نے جواب دیا کہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لیئے ہمارے مذہب میں ایسی کوئی تعلیم مباہلہ اور طریقہ نہیں۔ اور واپس چلے گئے۔

وضاحت

کیا آپ کے پاس آنحضرتؐ اور نجرانی مسیحیوں کے درمیان اس گفتگو کا کوئی ثبوت ہے تو وہ اولین فرصت میں کتاب کا نام اور اس کے اصل الفاظ درج کر کے اپنی صداقت ثابت کریں۔ مگر ہم جانتے ہیں۔

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

ویسے ہم قارئین اور خود پادری صاحب کی اطلاع کے لیئے اس گفت گو کا ترجمہ شائع کرتے ہیں :-

بخاری، مسلم، ترمذی کی روایت

"عاقب اور سید نجران کے سردار رسول اللہ صلعم کی طرف آئے تا کہ آپ سے ملاعنہ کریں۔ راوی (حذیفہ) کہتا ہے پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا ایسا مت کرو۔ خدا کی قسم اگر یہ نبی ہو اور ہم نے اس سے ملاعنہ کیا تو نہ ہم اور نہ ہماری نسل ہمارے بعد کامیاب ہوں گے۔"

سیرۃ ابن اسحٰق

وفد نجران (جو عیسائی تھے) ساٹھ سوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے چودہ ان کی قوم کے سردار تھے۔ جن میں عاقب (جس کا نام عبد المسیح تھا) اور سید (ایہم) کا نام بھی لیا ہے۔ اور عاقب ان کا سردار تھا۔ اور سید ان کا لاٹ پادری تھا۔ ان لوگوں کا ڈیرہ نبی کریم صلعم نے مسجد نبوی میں لگوایا۔ اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد ہی میں انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی،

پس جب انہوں نے دلائل نہ مانے اور الوہیت مسیح کے عقیدہ پر اصرار کیا تو نبی کریم ؐ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا ہمیں مہلت دیجیے کہ ہم مشورہ کر لیں۔ سو جب انہوں نے مشورہ کیا تو یہی قرار پایا کہ مباہلہ کرنے میں ہماری خیر نہیں اس لیے انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا۔ جزیہ قبول کر لیا۔

تفسیر طبری

دور اول کے مشہور مفسر قرآن محمد بن جریر طبریؒ "آنحضرت صلعم کی وفد نجران سے گفتگو" کی سرخی کے تحت لکھتے ہیں :-

"نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عیسیٰ بن مریم کے متعلق آپ سے بحث کی اور آپ کو کہا کہ اس کا باپ کون ہے۔ اور اللہ پر جھوٹ اور بہتان کیا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے نہ اپنی جورو بنائی اور نہ بیٹا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں ہوتا۔ مگر وہ اپنے باپ سے مشابہہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا۔ اور عیسیٰ ؑ پر فنا آئی۔ انہوں نے کہا کہ۔ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس کی نگہبانی کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا عیسیٰ ؑ ان میں سے کسی بات کا اختیار رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمانوں اور زمینوں کی کوئی بات مخفی نہیں؟ (آیت ۳) انہوں نے کہا۔ ہاں۔ فرمایا کیا عیسیٰ ؑ کوئی بات جانتا ہے سوائے اس کے

جس کا علم اسے دیا گیا۔ انہوں نے کہا۔ نہیں۔ فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰؑ کی صورت جس طرح چاہا رحم میں بنائی۔ (آیت ۵) اور آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب کھاتا نہیں۔ کھاتا اور نہ پانی پیتا ہے۔ اور نہ قضائے حاجت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰؑ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورت حمل میں لیا کرتی ہے پھر اس کو جنا جس طرح عورت اپنا بچہ جنا کرتی ہے۔ پھر اس کو غذا دی گئی۔ جس طرح بچوں کو غذا دی جاتی ہے۔ پھر وہ کھانا کھاتا تھا۔ اور پانی پیتا تھا اور پاخانہ کرتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ آپ نے فرمایا پھر تم جو دعویٰ کرتے ہو وہ کیسے کرتے ہو"۔ (تفسیر طبری)

اب بتائیے کہ آپ نے جو اعتراض کیا ہے اسے نجران کے عیسائی سیاسی اور دینی سرداروں کی گفت گو سے کوئی تقویت ملتی ہے؟

کیا نجران کے عیسائی سرداروں اور آنحضرتؐ کی گفت گو میں عمران اور ہارون کا کہیں ذکر ہے؟ کیا عمران کے سلسلہ میں آنحضرتؐ نے ان سے مباہلہ کی تجویز پیش کی تھی، کیا مباہلہ کے ضمن میں ان سرداروں نے جناب کی فضول دلیل پیش کی تھی اور واپس چلے گئے تھے۔

قرآن حکیم میں آیت مباہلہ کا موضوع مسیح کی ابنیت اور الوہیت تھی۔ عمران اور ہارون سے مریم کا نسبی تعلق نہ تھا۔ اسی سے متعلق باہم تبادلہ خیال ہوا اور نجرانی سرداروں نے متاثر ہو کر مباہلہ سے گریز کر کے جزیہ پر صلح کر لی۔ اور بعد میں اکثر مسلمان ہو گئے۔ یہ دینی اور سیاسی رہنما آپ کے مقابلے میں

زمان و مکان کے لحاظ سے ہم سے بہت قریب تھے۔ اسی لیئے ان کی نظر یا دریا نہ کج بحثی پر نہ تھی۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے دلائل کے سامنے گردن جھکا دی۔ آیہ مباہلہ کے الفاظ بھی ہماری تائید کرتے ہیں:-

"بے شک عیسیٰؑ کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کے مانند ہے۔ اسی مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔ حق تیرے رب کی طرف سے ہے۔ پس تو جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ پھر اگر کوئی اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا اس کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرے تو کہہ، آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو، اور اپنے اور تمہارے لوگوں کو بلائیں پھر گڑگڑا کر دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں" (۳: ۵۹-۶۱)

ہمیں امید ہے کہ آپ اس جھوٹ کو ترک کر کے کوئی نیا جھوٹ تراشیں گے کیونکہ آپ خلقاً و خُلقاً مجبور ہیں۔ لیکن دوسرے بہت سے صحیح الفطرت حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

حرفِ آخر

ہمارے رسول حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت مسیحؑ اور آنحضرتؐ ایک ہی سلسلہ ہدایت کی کڑیاں ہیں۔ وہ ایک ہی دین کے ہادی تھے۔ ان سب نے اللہ تعالیٰ

سے وحی کے ذریعے ہدایت پائی۔ اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی۔ مگر زمانے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضے اور تعلیمات بدلتی گئیں۔ حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ انبیاء کا دین اسلام مکمل ہو گیا۔ اور اس کی حفاظت کا بھی کماحقہ انتظام ہو گیا۔ ان سب انبیاء کا مشن آخر کار کامیاب ہو گیا۔ اور ان کا ذکر اسلام کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جانے لگا۔

ہم حضرت مسیحؑ اور مسیحیت کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اسلام کی کامیابی حضرت مسیحؑ کی بھی کامیابی ہے۔ اور جن مسیحی خواص و عوام نے ابتدائی زمانے ہی میں اسلام قبول کر لیا انہوں نے حضرت مسیحؑ کو اصلی صورت میں مان لیا۔ اور جس توحید کی تکمیل کے لیے آپ بائیبل کی تائید میں مبعوث ہوئے تھے اسے قرآن حکیم میں کامل شکل میں اختیار کر لیا۔

ہمیں اس بات کا رنج ہے کہ اس برصغیر میں کذب و افترا کی جو روش پادریوں نے انگریزی دور میں اختیار کی تھی پادری برکت اے خاں جیسے مسیحی ابھی تک اسی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اور اپنی علمی فرومائیگی اور جہالت کے باوجود اس دل آزار روش کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں۔ حالانکہ اب مغربی دنیا اور یورپ سمیت بلند پایہ مسیحی علماء نے اسلام سے متعلق اپنی روش بدل لی ہے۔ اور اس تبدیلی کا حیرت انگیز پہلو اسلام سے متعلق وہ تاریخی تقریر ہے جو صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے گزشتہ دنوں اقوام عالم کی جنرل اسمبلی میں کی اور اقوام عالم کے نمائندوں نے انہماک اور فراخدلی سے سنی۔

پادری برکت اے خاں کا اسلام سے بے خبر ہونا ایسی بات نہیں کہ وہ اپنے اعتراضات بیان نہ کریں۔ لیکن ان کا ول آمیز انداز تحریر اور ان کے خیالات کی تردید کے بعد ان کا انہی اعتراضات کو دہراتے چلے جانا کسی شریف انسان کے شایان شان نہیں۔ اگر وہ ہمارے دلائل سے مطمئن نہیں تو پھر معقول طریق پر ان پر تبصرہ کریں۔ اور دلائل کے ساتھ ان کی تردید کریں۔ لیکن بار بار اپنے اعتراضات کو دہرانا اور سوقیانہ انداز سے دہرانا انتہائی شر انگیز بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ہم نے اپنے جوابات میں پادری برکت کے عقائد کی روشنی سے بعض اوقات تلخ الفاظ سے کام لیا۔ لیکن اس پر ہمیں مجبور کیا گیا اور ہمیں اس سے خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن مخالف کے معتقدات کو سامنے رکھ کر ترکی بہ ترکی جواب بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقوام عالم اور انسانیت پر عظیم احسان یہ ہے کہ آپ نے ایک کامل لاشریک خالق کل، رب العالمین۔ اللہ۔ کا تصور پیش کیا۔ اور انسانی عظمت کو قائم کرنے کے لیئے انسان کو کائنات میں اعلیٰ اور اشرف مقام بخشا۔ اور اللہ تک رسائی کے سب کے لیئے بلا امتیاز دروازے کھول دیئے۔

آپ کے دین میں امن، عدل اور آزادی کے قیام کے لیئے نسل انسانی کی وحدت، دنیا بھر کے دینی رہنماؤں کی عزت اور مذہبی کتابوں کے احترام کا سبق دیا۔ اور انسانوں میں امتیاز کا ایک معیار، تقویٰ نیکی کو ٹھہرایا۔ گویا انسان

نیک وجود دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور دنیا بھر کے نیک انسانوں کو متحد ہو کر بدی کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ آپ نے دنیا بھر کے یتیموں، بیواؤں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی فلاح و بہبود اور دکھوں کے مداوا کے لیئے متحد ہو کر جدوجہد کی تلقین کی۔ اور اس مقصد کے لیئے دنیا بھر کے خوشحال لوگوں پر زکوٰۃ عائد کر دی۔ تاکہ دنیا میں آہوں، کراہوں اور دکھوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور یہ اصول پیش کیا کہ خوشحال لوگوں کے اموال میں حاجت مندوں اور محروموں کا حق ہے۔ آپ نے سماجی خرابیوں اور اخلاق کی اصلاح کے لیئے اپنے اخلاق کا ایک بلند نمونہ چھوڑا۔ اور ہر طبقے کے انسانوں کے لیئے زندگی کے ہر شعبے میں بہترین عملی نمونہ چھوڑا آج بھی عالم انسان آنحضرت صلعم کے عالمگیر اصولوں پر متحد ہو کر دنیا میں اتحاد امن، انصاف، حریت ضمیر اور فلاح پا سکتا ہے۔

پادری میدان چھوڑ کر

بھاگ کیوں گئے

راتے ونڈ کے پادری سیمسن نے اسلامی مشن کے سر پر یہ الزام تھوپا کہ "اسلامی مشن والے انجیلوں کے ترجموں پر اپنے سوالات اور اعتراضات کی بنیاد رکھتے ہیں" ہم نے اس کے جواب میں انہیں للکارا اور کہا کہ

"ہم دس ہزار روپے انعام دیں گے۔ اگر وہ اصلی انجیل جو حضرت مسیح پر ان کی مادری زبان میں نازل ہوئی تھی پیش کر دیں۔"

اس پر رائیونڈ والے صاحب نے تو خاموشی اختیار کرلی

(باسی کڑھی میں اُبال)

مگر گوجرانوالہ عیسائی سینیری کے دل میں جوش آیا اور ہمیں چیلنج کیا کہ "بیس ہزار روپیہ انعام ملیگا اگر اسلامی مشن والے وہ انجیل جو آرامائی زبان میں اتری تھی۔ دکھلا دیں" اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ دعویٰ ہمارا تھا عیسائیوں کا فرض تھا کہ اپنے مذہب کی سچائی کے لئے ہمارا ابطال کرتے کہ حضرت یسوع مسیح پر آرامی زبان میں انجیل کا نزول ہوا لیکن ایسا کرنے کی بجائے اسلامی مشن والوں کو کہتے ہیں کہ۔ کہ آرامی زبان کی انجیل دکھاؤ۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے ہم نے ٹھوس دلائل اور ثبوت انہی کی کتابوں سے پیش کئے۔ جنہیں ذیل میں پھر ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔

(مسیحی دوستو! غور سے پڑھو)

(۱) متی نے عبرانی زبان میں خداوند کے کلام کو جمع کیا (ص۲۴) (۲) عبرانی سے مراد ارض مقدس کے یہودیوں کی زبان تھی۔ جو آرامی زبان ہے (ص۲۵) (۳) یہ رسالہ نہایت معتبر تھا۔ اس کو بارہ رسولوں میں سے ایک نے خود اپنے مبارک ہاتھوں سے لکھا تھا اور حضرت کلمۃ اللہ کی عین حیات میں جمع کیا تھا (ص۲۴) (۴) یہ رسالہ ۱۹۲ آیات پر مشتمل تھا۔ ص۲۴ (قدامت و اصلیت اناجیل اربعہ جلد دوم صفحہ ۲۴۰ مصنفہ آرچ ڈیکن پادری برکت اللہ)

(۱) اس خارجی شہادت سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ کم از کم دو یا زیادہ اناجیل آرامی زبان میں یروشلم کی بربادی سے بہت پہلے ارض مقدس میں مروج تھیں (۲) آپ سامعین کو آرامی زبان میں تعلیم دیتے جو گلیلیوں کی مادری زبان تھی صفحہ ۱۴۳۔ وہ زبان جو ہمارے خداوند عام طور پر بولتے تھے آرامائی تھی۔ اس زمانہ میں عبرانی بالکل مردہ ہو چکی تھی۔ صفحہ ۶۹ (لائف آف کرائسٹ مصنفہ الیف۔ ڈبلیو۔ فرار ڈی ڈی ڈین آف کنٹربری مطبوعہ ۱۸۹۶ء)

اگر وہ (حضرت مسیح) سادہ آرامی زبان میں گفتگو کرتا تھا۔ تاہم اس کے الفاظ روح اور زندگی تھے (۶۳:۶ ۲۵)۔ (۲) چاروں رسولوں نے اپنے خاص نقطہ نظر کے مطابق اناجیل کو تحریر کیا۔ اور اسی نقطہ نظر کے مطابق مسیح کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں اور اس کے کاموں کو منتخب کیا۔ ان کے بیانات میں بہت سے ظاہری اختلافات ان کے مقاصد پر غور کرنے سے حل ہو جائیں گے۔ بعض بیانات میں جو فرق نظر آتا ہے وہ آرامی زبان سے یونانی میں ترجمہ کرتے وقت مختلف امور کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے کے باعث ہے۔ (ہماری کتب مقدسہ، ترجمہ مسز کے۔ ایل ناصر)

اتنے ثبوت فراہم ہونے پر بھی اگر پادری صاحبان اور اہل کلیسا اس بات سے انکار کریں کہ آرامی زبان میں انجیل کا وجود نہیں تھا۔ تو ہم صرف ان کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں

اصل سے فرار: ان دلائل و براہین نے پادریوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ اور انھوں نے اصل آرامی انجیل کو پیش کرنے کی بجائے اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے ایک آسان راہ فرار اختیار کی۔ جولائی ۱۹۶۹ء کے عیسائی رسالہ "کلام حق" گوجرانوالہ نے اعلان کر دیا کہ:۔ "خداوند مسیح پر کلام کے نزول کا مسئلہ مسیحوں کے ایمان میں شامل نہیں۔ مسیحی ہرگز نہیں مانتے کہ آپ پر کوئی انجیل یا کلام نازل ہوا تھا" نیز یہ کہ "مسیحوں کا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ خداوند مسیح پر انجیل آرامی، یونانی یا کسی اور زبان میں نازل ہوئی۔ یہ سوال ہی غلط ہے" (کلف اے سنگھ (بحوالہ کلام حق جون، جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۳)

ع: چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

اسلامی مشن۔ سنت نگر۔ لاہور